بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاؤسٹ

(از: گوئٹے)

مترجمہ

شاہد احمد۔ بی۔ اے۔(آنرز) دہلوی

ایڈیٹر ساقی و شاہجہاں دہلی

ناشر: ساقی بکڈپو۔ دہلی

بار اوّل

قیمت ایکروپیہ چار آنہ

مطبوعہ جمال پرنٹنگ ورکس دہلی

بخدمتِ گرامی مولانا عنایت اللہ صاحب دہلوی

جنابِ عالی

آپ نے اِس ترجمے کی تعریف فرمائی

آپ نے از راہِ لُطف اِس کی نظرِ ثانی فرمائی

اجازت دیجئے کہ

آپ ہی کے نام نامی سے اِسے معنون بھی کردوں۔

ع۔ کرمہائے تو مارا کرد گُستاخ

شاہد

نگاہِ اوّلیں

فاؤسٹ کی روایت جرمن قوم میں کم و بیش چار سو سال سے مشہور ہے۔ مُحققین کا خیال ہے کہ اس روایت کی ابتدا ایک قدیم مجوسی کہانی سے ہوئی جو قوائے فطرت کو معبود قرار دینے سے ظہور میں آئی۔ وہ فلسفی اور مُحقق جو فطرت کے رازہائے سربستہ معلوم کرنے میں مُنہمک رہتے تھے۔ اُن کے متعلق عوام کا یہ خیال ہو جاتا تھا کہ اُنہیں فوق الفطرت قوتیں حاصل ہو گئی ہیں اور انہیں جادوگر یا ساحر سمجھنے لگتے تھے۔ سولہویں صدی میں مجوسی روایت فاؤسٹ سے وابستہ ہو گئی۔ فاؤسٹ کی شخصیت تاریخی زیادہ اور روایتی کم ہے۔ اور جرمن ادب العوام کا تو اسے ہیرو سمجھنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں فاؤسٹ نامی ایک شخص ابتدائی سولھویں صدی میں موجود تھا اور اس میں چند غیر معمولی صفات بھی تھیں۔ اس کے متعلق توہّمات کی وہ کثرت ہوئی کہ اس کی اصلی شخصیت فراموش ہو گئی۔ اس روایتی فاؤسٹ کے متعلق طرح طرح کے قصّے لکھے گئے جن کا ذکر یہاں غیر ضروری سا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ کرسٹوفر مارلو نے اس کہانی کو منظوم ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا اور یہ ڈرامہ اپنی شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے شیکسپیئر کی شاعری سے کسی طرح کم نہیں کہا جا سکتا۔ مگر فی الحقیقت گوئٹے نے فاؤسٹ کو غیر فانی عظمت و شہرت دی ہے۔ اس سے پہلے فاؤسٹ

کو جادوگر یا مسخرہ بنا کر پیش کیا جاتا تھا لیکن گوئٹے نے اسے ایک پُر وقار شخصیت کا مالک بنایا اور اپنے میفسٹوفلیس (شیطان) کو بھی وجیہہ اور عظیم کردار بنایا۔ گویا اِس پامال کہانی کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہونچایا۔ جرمن ڈرامہ نگار لسنگ کی طرح گوئٹے نے بھی اس خیال کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ آخیر میں فاؤسٹ ملعون و مردود ہو کر نہ مرے بلکہ اس کی نجات ہو جائے۔ یہی خیال ہیٹر برسٹن اور ہنری سے وج کی اس کہانی میں بھی قائم رکھا گیا ہو جس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کہانی فلم کے لیے لکھی گئی تھی اس لئے اِسے زیادہ سے زیادہ نظر فریب بنایا گیا ہے۔ بصورت موجودہ فاؤسٹ کی کہانی حد درجہ عام فہم اور دلچسپ ہو گئی ہے۔ گوئٹے کا ڈرامہ فاؤسٹ ایک اعلیٰ درجے کی علمی چیز ہے۔ اس کے پہلے حصّہ کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہے۔ پیشِ نظر کہانی کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔ اِس کہانی کی حیثیت اگر کچھ ہے تو صرف ادبی، اور چونکہ پیرایۂ بیان کہانی کا اختیار کیا گیا ہو۔ اِسلئے اسمیں ایک طرح کی بے ساختگی اور دلکشی پیدا ہو گئی ہو۔

آخیر میں مجھے اپنے دو مُربّی بزرگوں کا شکریہ ادا کرنا ہو جو فنِ ترجمہ کے اختصاصی ہیں، پہلے مولانا عنایت اللہ صاحب دہلوی جنہوں نے اس ترجمہ کی نظرِ ثانی فرمائی اور اس کی نوک پلک بنائی۔ دوسرے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ جنہوں نے اپنی بے انتہا مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس کہانی کا پیش لفظ تحریر فرمایا۔

شاہد احمد دہلوی

پیش لفظ

گوئٹے نے اپنے شہرۂ آفاق ڈراما فاؤسٹ کی بُنیاد جرمن ادب العوام کے ایک مشہور قصّے پر رکھی تھی۔ جو اُس کے زمانے میں بہت مقبول تھا۔ عوام کی اکثر کہانیوں کی طرح اس کہانی میں بھی ایک فلسفیانہ حقیقت دبی اور سمٹی ہوئی تھی۔ جسے گوئٹے نے اپنے ڈرامے میں اُبھارا اور پھیلایا۔ گوئٹے اس راز سے واقف تھا کہ زندہ اور پائدار ادب وہی ہے جو عوام کی سمجھ میں آسکے اور اُن کے دل میں بھی گھر کر سکے۔ اِس بات کو وہ "تماشا گاہ کے تمہیدی سین" میں مسخرے کی زبان سے ان الفاظ میں ادا کرتا ہے "جسے اپنے خیالات دلچسپ پیرائے میں ادا کرنا آتا ہے وہ عوام کے تلوّن کا رونا نہیں روتا۔ اس کے لئے تو جتنا بڑا حلقہ ہو اُتنا ہی اچھا۔ جتنے زیادہ لوگ ہوں گے اُتنا ہی زیادہ اثر ہوگا۔"

فاؤسٹ کا پہلا حصّہ، اپنی فلسفیانہ گہرائی اور شاعرانہ نزاکت کے باوجود گوئٹے کے زمانے میں عام فہم اور عام پسند تھا۔ مگر سَو سال میں زمانے کا مذاق بہت بدل گیا ہے خصوصاً سینما نے پبلک کی نظروں کو ایسے حیرت انگیز اور ہیجان خیز مناظر کا عادی کر دیا ہے کہ گوئٹے کا فاؤسٹ اب عام پسند نہیں رہا چنانچہ اس ڈرامے کو پردۂ تصویر پر

لانے کے لئے اس میں تصرّف اور رنگ آمیزی کی گئی اور اس طرح وہ "فاؤسٹ" وجود میں آیا۔ جس کا ترجمہ شاہد احمد صاحب مدیر ساقی نے اُردو میں کیا ہے۔

اصل کتاب کے متعلق مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ اس کا خاکہ وہی ہے جو گوئٹے کے فاؤسٹ کا تھا مگر قصّہ کو زیادہ دلچسپ اور فلم کے قابل بنانے کے لئے اُس میں بہت کچھ تصرّف کیا گیا ہے، مناظر کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ اصل ڈرامے کے بعض منظر چھوڑ دئے گئے ہیں اور بعض نئے منظر بڑھائے گئے ہیں۔ اس ردّ و بدل سے قصّے کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اِسے گوئٹے کے ڈرامے سے کوئی نسبت نہیں مگر ع بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی۔ اور تماشا دیکھنے سے اہلِ نظر بھی نہیں چوکتے۔ فاؤسٹ کا یہ نیا چولا ذوقِ تماشا کی بخوبی تسکین کرتا ہے۔ ادبی قدر و قیمت اس کی یہ ہے کہ یہ گوئٹے کے فاؤسٹ کے لئے تعارف کا کام دیتا ہے اور یہ کچھ کم نہیں۔

ترجمہ شاہد احمد صاحب نے ایسا ہی کیا ہے جیسی اُن سے توقع تھی —— صاف، سلیس، رواں اور شگفتہ۔ ادبی کتابوں کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں، جو عبارت یوں پڑھنے میں اچھی خاصی سہل معلوم ہوتی ہے ترجمہ کرنے بیٹھئے تو پہاڑ ہو جاتی ہے۔ شاہد صاحب کو جو کوہ کنی کرنی پڑی اُسے اُنہی کا دل جانتا ہوگا۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گئے۔

سیّد عابد حسین

مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں توبہ

دوست ہو نہ دشمن ہو آدمی غنیمت ہے

فاؤسٹ

ابتدائیہ

تاریکی کے دروازے کھلے اور ابلیس نے اُن میں سے دُنیا پر نظر ڈالی۔ اُس کے سر پر سینگ تھے اور وہ بھیانک تھا۔ اور اُس نے دُنیا اور دُنیا کے سرمایہ آب پر اپنا ایک لمبا سانس چھوڑا۔ نسلِ آدم خوف سے اس کے آگے سرنگوں ہوگئی کیونکہ اس کا سانس عذاب تھا، موت اور تباہی تھا۔ اور اُس نے اپنے کارنامے کو دیکھا اور قہقہہ لگایا۔

اور پھر ایک زور کی سرسراہٹ سُنائی دی اور خیرہ کُن چمک پیدا ہوگئی۔ اور لو! ایک سحاب منور پر ایک فرشتۂ نُور کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ دیکھے سے خوف آتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک دہکتی ہوئی تلوار تھی۔ اور تلوار پر ایک لفظ لکھا تھا — "صدق"۔

اور فرشتۂ نُور نے اپنے لب وا کئے اور اس طرح بولا جیسے بانسریاں بجتی ہوں:-

"دُنیا کے باشندوں پر تُو جنگ، طاعون اور قحط کا عذاب کیوں نازل کر رہا ہے؟"

اور ابلیس نے جواب دیا۔ "دُنیا میری ہے"۔

یہ کہہ کر وہ ہنسا اور اُس کی ہنسی ایسی تھی جیسے پیتل کی ڈھالوں کے ٹکرانے سے جھنکار پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرشتۂ نور پھر بولا "اُس وقت تک دُنیا تیری کبھی نہیں ہوسکتی جب تک کہ انسان تلاشِ صدق ترک نہ کردے۔ نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی قوت ہر انسان کو بخشی گئی ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کو فراموش کر بیٹھے اور تُو دُنیا پر چھا جائے۔"

پھر ابلیس نے اُونچی آواز میں کہا "سب انسان بد ہوتے ہیں اور ہولے نفس کے غلام ہوتے ہیں۔"

فرشتۂ نور نے اُس کے جواب میں کہا۔ "فاؤسٹ معلّم کو دیکھ اور اُس کی بات سُن!" یہ کہہ کر اُس نے اپنی دہکتی تلوار کی ایک ضرب لگائی اور لو! اُن کی آنکھوں کے سامنے فاؤسٹ آگیا۔ جو بیٹھا دُنیا کے جوانوں کو عقل کی باتیں سکھا رہا تھا۔

پھر ابلیس چیخ کر بولا۔ "فاؤسٹ بھی سب کی طرح بدکردار ہے۔ وہ اپنے لبوں سے نیکی کا درس دیتا ہے مگر اس کے ہاتھ بدی میں مشغول رہتے ہیں۔ اِس کے دل میں مال و دولت کی ہوس ہے۔ اُسے پارس پتھر کی تلاش ہے جو ہر چیز کو سونا بنا دیتا ہے۔ میری سُنو! میں قسم کھاتا ہوں کہ فاؤسٹ کی رُوح خدا سے چھین کر رہوں گا۔" یہ کہتے کہتے غرور سے اُس کا سر اُونچا ہوگیا، ایک ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں خوفناک طور پر چمک رہی تھیں۔

پھر فرشتۂ نور نے اپنی تلوار کی ایک اور ضرب لگائی اور اس سے ایک تیز سفید روشنی کا بڑا سا شعلہ نکلا اور ابلیس نے اپنی آنکھیں چھپا لیں۔ کیونکہ وہ اس شعلے کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔

اور فرشتہ بولا "اُس مقدس چنگاری کو جو فاؤسٹ میں چمکتی ہے اگر تُو غارت کر دے تو دُنیا تیری ہو جائے گی"۔

پھر ابلیس نے اپنا ایک ہاتھ اُوپر اُٹھایا جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاریکی کا ایک مینار ہے اور زور سے چیخ کر بولا "ابلیس کی تاب مقاومت کوئی نہیں لا سکتا۔ اپنے قول پر قائم رہنا"۔

اور فرشتۂ نُور رخصت ہوا اور اُس کے جانے میں ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے پیچ و تاب کھاتے پانی کی گڑگڑاہٹ، اور روشنی کی چمک اس کے ساتھ معدوم ہوئی اور تاریکی کے دروازے پیتل کی سی جھنکار کے ساتھ بند ہوئے۔ اور دروازوں کی دوسری طرف سے شیاطین کے قہقہوں کی آواز گونجتی سُنائی دی۔

حصّہ اوّل

پہلا باب

سولھویں صدی کا آغاز ابھی ہوا ہی تھا اور سارا یورپ اپنی تاریخ کے سب سے زیادہ نازک دَور میں سے گزُر رہا تھا۔ ہر ملک میں ایک جدید و شدید رُوبیداری کی دوڑ رہی تھی۔ طباعت کی ایجاد اور یورپ کی ہر زبان میں مترجمین کی کثرت نے کلاسی ثقافت کے خیرہ کُن خزانے اور مشرق کے سائنٹیفک سرمایۂ ذہنی کو سب کے سامنے پیش کر دیا۔ علم کی تجدید ہوئی اور لوگوں نے زندگی کو ایک نئے تنقیدی زاویۂ نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ نشاۃ الثانیہ کے دامن میں قرونِ وسطیٰ کے رواجی فلسفہ، آرٹ اور مذہب کے خلاف بغاوت کے جراثیم نشوونما پا رہے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ ظلم و موت بھی پروان چڑھ رہی تھی، کیونکہ قدیم معتقدات کے رہنما جو نئے خیالات اور جدید تصورات کو کچل ڈالنا چاہتے تھے۔ خوف اور نفرت سے اپنا آخری وار کرنا چاہتے تھے اور وہ اس طرح کہ آگ اور دیگر آلاتِ تعذیب کی امداد سے انسان کے حافظے سے جدید معتقدات و رُجحانات کو اکھاڑ پھینکیں یا جلا کر غارت کر دیں۔

لیکن انسان کو خواہ وہ کتنے ہی پُرآشوب زمانے میں سانس لیتا ہو، اُن زبردست

قوتوں کا صحیح احساس نہیں ہوتا جو زمانے کا رُخ بدل دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سیکسنی کے حسین شہر روڈا کی خوش باش آبادی اِن باتوں سے ناواقف تھی اور یہاں کے لوگ اُس نئی تحریک کی طرف سے بے پرواہ تھے جو اُن کے مُلک میں زور پکڑ رہی تھی۔

نشاۃ الثانیہ کا تسلّط آہستہ آہستہ اور چُپکے چُپکے اس شہر پر اُسی طرح ہو گیا جیسے عذابِ سیاہ جمع ہو کر شہر پر چھا جائے۔ دُور سے روڈا ایک عجیب چھوٹا سا کھلونا معلوم ہوتا تھا۔ سُرخ سُرخ جھکی ہوئی چھتیں جن میں سے دُودکش نکلے ہوئے، سبز سبز گھاس کے قطعے، بازار کے دوراہوں پر اُونچے اُونچے جھومتے چنار کے درخت، بَل کھائے ہوئے راستے، نازک نازک مینارے، صاف سُتھرے چوراہے اور کلیساؤں کی اُبھری اُبھری چھتیں۔ دُور سے اِس شہر کا بڑا دلکش منظر تھا۔ اُس کے پیچھے تھورنگیا کے سبز رنگ رومانی جنگلات تھے جو ہوا سے جھومتے، سرد آہیں بھرتے، سرگوشیاں کرتے یا دھاڑنے لگتے۔ اِس پس منظر سے روڈا کی خوبصورتی اور بھی نکھر گئی تھی۔

لیکن دُور سے بھی اب یہ معلوم ہونے لگا تھا کہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات اس شہر میں ہو رہی ہے۔ وہاں خوب چہل پہل، رنگینی اور مسرّت کی گہما گہمی تھی، گھنٹیاں بج رہی تھیں اور جب ہوا کا رُخ ہوتا تھا تو شادیانوں کی آواز، آلاتِ موسیقی کی دلنواز صدائیں اور بہت سے آدمیوں کی دُور کی آوازیں ہلکی ہلکی سُنائی دیتیں۔

یہ سب کچھ اِس لئے تھا کہ روڈا میں آج خاص چھٹی کا دن تھا۔ یہ وہ دن تھا جس کا انتظار خُشک مزاج سے خُشک مزاج آدمی کو بھی سال بھر سے تھا، اور گُذشتہ

سال کی خوش فعلیوں کی یاد تازہ کرکے اس سال کے لئے اپنی گزشتگی عیش کو بڑھا رہا تھا۔ آج وہی یوم مسرت تھا جس کی آس سب لگائے بیٹھے تھے۔

روڈا میں آج سالانہ میلہ تھا۔ آس پاس کے گاؤں والے صبح ہی سے جوق در جوق آرہے تھے۔ ان کے پاس یا تو بکری کا مال تھا یا اس میلے میں خرچ کرنے کے لئے روپیہ، سب کے حوصلے بڑھے ہوئے اور دل بشاش تھے۔ اس خبر نے بھی کہ ویمر اور النبرگ میں خوفناک طاعون پھوٹ پڑا ہے اُن کے جذبۂ مسرت کو مضمحل نہیں کیا۔ کیونکہ ویمر اور النبرگ یہاں سے کئی میل دُور تھے اور سُورج چمک رہا تھا اور موسیقی انہیں آواز دے رہی تھی اور حیاتِ سیّال جو اُن کی رگوں میں اُچھل اور تڑپ رہی تھی اُن کے کان میں کہہ رہی تھی "تم جوان ہو اور ہمیشہ زندہ رہو گے"

سوائے فقیروں اور کنگلوں کے جو اس میلے میں کھنچ آئے تھے باقی اور سب میلے کے عجیب عجیب کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بازاروں میں کھوے سے کھوا چھل چھلتا تھا۔ ضعیف مرد اور عورتوں کے کندھوں پر رنگین کپڑوں کو نوجوان حقارت سے دیکھتے تھے اور اُن پر آوازے کستے تھے۔ یہ نوجوان اِترا اِترا کر چلتے تھے۔ ٹانگوں پر رنگین چُست لباس تھا اور اپنی خوشنما ٹانگوں پر انہیں بہت ناز تھا۔ اُوپر کے کپڑے رنگ برنگے تھے، چپٹی کُھلی ٹوپیاں تھیں جن میں رنگے ہوئے پَر خوبصورتی سے لگے تھے یا کسی کسی میں پھول نظر آتے تھے اور یہ پھول وہ ہوتے تھے جو انھوں نے کسی دوشیزہ سے اُچک لئے تھے یا کسی حسینہ نے بطور محبت کی نشانی کے انہیں دیے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری آبادی پورا دن عیش و عشرت میں گذارنے پر تُلی ہوئی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ میلے کے میدان کی طرف مزے مزے سے باتیں کرتے اور ہنستے جا رہے تھے۔ خوشی کے غُل غپاڑے، مسرت کی چیخوں، نغموں کے شور اور گھنٹیوں کی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ میلہ خوب بھر رہا ہے۔

شہر اور تھورنگیا کے جنگلوں کے درمیان جو سرسبز وادی تھی اُس میں یہ میلہ لگتا تھا۔ وسط میں جھولا جھولنے کی کشتیاں تھیں اور اُن کی شکلیں بھوت پریتوں کی سی تھیں یا بڑے بڑے بڑے فلس دار اژدہوں کی شبیہ بنائی گئی تھی۔ پھٹے ہوئے سیاہ حلق، لال لال نکلی ہوئی زبانیں اور خوفناک آنکھیں۔ ایک طرف ایک بڑے سے احاطے میں تماشے تھے۔ ان میں سے بعض کے منڈوے دو منزلہ بھی تھے جو چیڑ کے تختوں کو جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ احاطے کی دیواریں چمکدار رنگوں کے کرمچ کی تھیں اور ان پر بھدی بھدی سی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ کہیں ننگی لڑکیاں اور اژدہے دکھائے گئے تھے، کہیں کہیں جھولوں کو پُرانی وضع کے مطابق سجایا گیا تھا۔ ہر تماشہ گاہ کے آگے ایک تنگ برآمدہ تھا جس کا رُخ سیلانیوں کی طرف تھا۔ اس میں سے اس تماشے کا مالک چیخ چیخ کر ان حیرتناک کارناموں کا اعلان کرتا تھا جو اندر دکھائے جاتے تھے۔

انہی برآمدوں میں مسخرے اور ہنستے چُغل بھی نظر آتے تھے۔ یہ ناچتے رہتے تھے۔ یا تماشائیوں پر فقرے چُست کرتے تھے یا سیدھے بانسوں پر بغیر کسی سہارے کے

چڑھتے اُترتے تھے۔ اور کُبڑے، ٹھنگنے بَونے وضع وضع کے لباس پہنے طرح طرح کے مُنہ بناتے، ہاتھ مٹکاتے، ناچتے، اُچھلتے کُودتے، اور کبھی کبھی نیچے اس طرح گرتے کہ دیکھنے والے سہم جائیں اور گرتے ہی کسی خوبصورت لڑکی پر جھپٹتے۔ تماشائی اِن کی اس تمسخر انگیز حرکت پر ٹھٹّے لگاتے اور وہ لڑکی گھبراہٹ میں اپنے مرد ساتھی کے سینے سے چمٹ جاتی اور گو اس کا ساتھی بھی کسی بدہیئت بَونے کی جھجکی سے بھوچکا سا ہوجاتا تھا لیکن پھر بھی وہ ایک سُور ما کی طرح اپنی محبوبہ کے تحفظ کے لئے سینہ سپر ہوجاتا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ بہادر ہے اور مصیبت زدہ لڑکی اس پر ہر وقت قابلِ اعتماد کرسکتی ہے!

چھوٹی چھوٹی دُکانوں میں دُکاندار بیٹھے روٹی اور مٹھائی بیچ رہے تھے۔ اِنہی کے ساتھ مقدس مقامات کے تبرکات، حُبّ کے تعویذ اور گنڈے اور پینے کے لئے ہر قسم کی چیزیں بھی موجود تھیں، بکری کا دودھ، شربت، اور بے شمار قسموں کی شراب! میلے کے بیچ میں جہاں جھُولے پڑے تھے۔ اُس کے قریب اور دلکش چیزیں تھیں۔ یہیں ایک کٹھ پتلی والا تھا جسے ایک مجمع کثیر گھیرے کھڑا تھا۔ یہ ایک کٹھ پتلی نچا رہا تھا جس کے سر کے بال سُرخ رنگ کے تھے اور بڑی سی ڈاڑھی تھی۔ یہ یہودا کی شبیہ بنائی گئی تھی اور یہ عجیب مضحکہ خیز طریقے سے اُچھلتی پھرتی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک بڑا سا بھُورا ریچھ تھا جو طرح طرح کے کرتب دکھا رہا تھا۔ تماشائی اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اِس جانور میں کوئی بھُوت سما گیا ہے۔

اس مجمع کے پیچھے ایک شہزورنٹ تھا۔ اس کا لباس سنہرے رنگ کا تھا اور وہ اپنے ایک پھیلے ہوتے ہاتھ پر ایک خوبصورت پھول سی بچی کا جھونک سنبھال رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے رنگین گیندیں اچھال کر لپک رہا تھا۔ اس کے گلے میں ایک سانپ لپٹا ہوا تھا اور ایک بندر اس کے سر پر بیٹھا اس کے بال نوچ رہا تھا اور دیکھنے والوں کی طرف دیکھکر چیختا اور چلاتا تھا۔

لیکن اس ساری گہما گہمی میں جو رنگ غالب نظر آتا تھا وہ سکیس لڑکیوں کا تھا اور ان لڑکیوں کو خود بھی اس کا احساس تھا۔ ان کے لباس سادے تھے۔ اونچی اونچی آستینیں، چمکدار اور شوخ رنگ کے لباس، گو کبھی کبھی سفید لباس بھی اُن میں نظر آجاتا تھا اور یہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سرخ چنگاریوں میں آنکھوں کو چندھیا دینے والی ایک تیز سفید چنگاری اُبھر آتی ہے۔ ان کے بال سن جیسے تھے یا سنہرے رنگ کے، کسی کسی کے سیاہی مائل بال بھی نظر آجاتے تھے۔ اُن کی دو دو چوٹیاں گندھی ہوئی تھیں اور ان میں رنگین موباف پڑے ہوئے تھے۔ پیشانی پر کسی رنگ کا کسا وا تھا۔ ان میں سے کئی کے گلوں میں پھولوں کے کنٹھے پڑے تھے۔ یا سینوں پر پھول لگے تھے، یہ آزادمنش لڑکیاں ناز و پندار کے ساتھ چلتی تھیں اور انکی آنکھوں کو قرار نہ تھا۔

روڈا کا یہ میلہ عشق و عاشقی اور حسن و محبوبی کی معرکہ آرائیوں کے لئے مشہور تھا۔ ایک نتیجہ اس سالانہ میلے کا یہ تھا کہ بے شمار شادیاں آپس میں ہو جاتی تھیں۔ اس وجہ سے اس میلے میں کچھ ایسی کشش تھی کہ کوسوں دُور سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔

ہر طرف خوشی و خرّمی تھی۔ ہر شخص کے خیالات کا مرکز اس وقت صرف وہی تھا جو پیشِ نظر تھا ـــــ عیش و نشاط، دلکشی، تجیر، خرید و فروخت، عشق بازی اور محبّت بھری نظریں۔ ان مسرّتوں میں وہ اس قدر منہمک تھے کہ کسی متنفس نے بھی اس تبدیلی کو محسوس نہیں کیا جو موسم میں بتدریج ہو رہی تھی۔ ہوا کا درجۂ حرارت کم ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ مشرق سے سیاہ بادل اُٹھے اور آسمان پر چھا گئے تھے اور اب اُن کا دَل اتنا موٹا ہو گیا تھا کہ اُنہیں دیکھنے سے ڈر لگتا تھا۔

نوجوانوں کے حلقے میں سے دو چمکدار آنکھوں والی لڑکیاں علیحدہ ہو کر ایک طرف کو کھڑی ہو گئیں۔ ایک پھٹے حالوں بُوڑھا دوتارے پر گتیں بجا رہا تھا اور نوجوان ناچنے میں مصروف تھے۔ لڑکیاں چپکے سے کھسک آئیں۔

ان میں سے ایک جس کا رنگ گیہواں تھا بولی "ایسا تم نے اُن دو طالبعلموں کی شوخ گفتگو سُنی؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ دونوں بہت حسین تھے، خصوصاً وہ جس کے لمبے لمبے گھونگر والے بال تھے۔"

دوسری نے ذرا ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ "مگر ذرا سوچو تو سہی کہ نوکرانیوں کا پیچھا کرنا اُن کے لئے کس قدر شرمناک ہے۔ حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ چاہتے تو رووڈا کی شریف و نجیب ترین لڑکیاں بھی اُنہیں اپنا ہم جلیس بنانے میں عار نہ کرتیں۔"

یہ لڑکیاں اسی طرح رازدارانہ گفتگو کر رہی تھیں کہ ایک ہمین گوش دوز آواز نے اُنہیں مخاطب کر کے سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا۔ یہ آواز ایک سوکھی ہوئی جھرّخ بڑھیا کی تھی

جو ایک چھوٹی سی دُکان کے آگے بیٹھی تھی اور اس کا کام یہ تھا کہ فال گوئی کرے اور عشاق کو آنے والی باتیں بتا کر صلاح مشورہ دے۔ کپکپاتی آواز میں لڑکیوں سے بولی:۔

"اہا پیاری بچیو! تم اگلے سال سے کس قدر حسین ہو گئیں۔ کیسی حسین معصوم لڑکیاں نکلی ہو! تمہاری آنکھیں دیکھنے کے بعد کون نوجوان ہے جو اپنے دل پر قابو رکھ سکے! نہیں نہیں تیوری نہ چڑھاؤ —— بوڑھی نیکنام نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس سے تم ناراض ہو۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو —— تعویذ گنڈا، ٹونا ٹوٹکا، صلاح مشورہ یا جو چیز بھی تمہیں درکار ہو بوڑھی نیکنام تمہارے لئے مہیا کر دیگی۔"

"چلو چلو۔ اگاتھا۔ یہاں سے جلدی چلو" اِلسا نے اپنے ساتھ والی سے کہا۔ "بازار میں ایسی عورت سے باتیں کرتے اگر کوئی مجھے دیکھ لے تو میں مارے شرم کے مر جاؤں"

یہ کہہ کر دونوں لڑکیاں اُس مجمع کی طرف چلدیں جہاں نٹ اپنے کرتب دکھا رہا تھا۔ اِلسا نے کہا۔ "یہ سچ ہے کہ اُس نے مجھے میرے ہونے والے عاشق کو گوشت پوست میں دکھایا تھا مگر مجھے تو اس سے ڈر ہی لگتا ہے۔"

اگاتھا نے جواب دیا۔ "میں اتنی خوش نصیب نہیں تھی۔ اُس نے شیشے کے گولے میں میرے عاشق کو دکھایا تھا۔ وہ تو مجھے ایک فوجی نظر آیا، بانکا سجیلا جوان۔ اسوقت سے میں اُس کی تلاش میں رہی مگر اب تک وہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ آؤ چلو نٹ کا تماشہ دیکھیں۔"

بڑھیا کی آواز اُن کے عقب میں سُنائی دی:۔

"بوڑھی نیکنام کے کان بہت تیز ہیں۔ شاید تمہارے کان بھی اتنے ہی تیز ہوں واپس آکر اُس کی بات سُن لو۔ دیکھو۔ تم میں سے ایک ایسی ہے جو آیندہ سال مجھے دیکھ نہ سکے گی ——— اُس کی پیشانی پر ایک سیاہ ستارہ ہے۔"

دونوں لڑکیاں خوف سے پیچھے ہٹ گئیں اور اس بھیڑ میں گھس گئیں جو نٹ کے گرد لگی ہوئی تھی۔ نٹ قلابازیاں کھا رہا تھا۔ اس کے مضبوط پٹھے بَل کھا رہے تھے اور اُن میں رگوں کی شاخیں پھوٹتی نظر آ رہی تھیں گویا اُن میں ہر جست و خیز کے ساتھ زندگی اُچھل رہی ہے۔

ایک تماشائی نے اپنے ساتھی سے کہا "میں نے اس سے بہتر نٹ اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ لیکن یہ سیکسنی کا باشندہ نہیں ہے۔"

"ہاں میرا خیال ہے کہ اطالوی ہے۔ دو مہینے ہوئے کہ میں نے اسی کو ڈیمر میں دیکھا تھا۔"

"ڈیمر میں! سُنا ہے کہ وہاں طاعون پھیل رہا ہے۔"

ایک جوان طالب علم جو اُن کے قریب کھڑا تھا ہنس کر بیچ میں بول اُٹھا "طاعون! نہیں یہ تو ایک افواہ ہے جو پادریوں نے اُڑائی ہے۔ ہمیں کلیسا میں واپس لانے کے لئے انھوں نے یہ چال چلی ہے۔"

اس کے پیچھے ایک گڈریا کھڑا تھا وہ بولا "نہیں نہیں لڑکے، ایسی چیزوں کا جیسی کہ موت ہے مذاق نہیں اُڑایا کرتے۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو میرے دادا ایک دفعہ کے

طاعون کا ذکر سُنایا کرتے تھے جس سے سارا مُلک تباہ ہو گیا تھا۔ کوئی خاندان ایسا نہ بچا تھا جس میں دو ایک موت کے گھاٹ نہ اُترے ہوں۔ وہ بڑا منحوس زمانہ تھا۔ خُدا پھر وہ وقت ہمیں نہ دکھائے۔"

اِسی وقت یہ ہوا کہ نٹ نے گھاس پر ایک چھوٹی سی دوڑ لگائی اور چھلانگ لگانے کی تیاری کی۔ سب کے سب پلٹ کر اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نٹ نے ایک بہت بڑی چھلانگ لگائی، ہوا میں تین پلٹیاں کھائیں اور بڑی صفائی سے ہاتھوں کے بل زمین پر آ ٹکا۔ پھر عُمدگی سے کمان کی طرح اُلٹی چھلانگ لگائی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ تماشائی واہ وا کر رہے تھے اور نٹ دونوں دونوں ہاتھوں سے سلام کرتا جا رہا تھا اور مُسکرا مُسکرا کر ناز سے اُنہیں دیکھتا جاتا تھا۔

مجمع میں ہر طرف سے آواز آ رہی تھی "شاباش، شاباش"

لیکن لوگوں کے دیکھتے دیکھتے نٹ کچھ کا کچھ نظر آنے لگا۔ اُس کے سُرخ چہرے کا سارا خون ایک دم سے سُن گیا۔ موت کی طرح اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے۔ دھوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ گیا۔ اُس کے گھٹنے کانپ رہے تھے اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو ہٹا۔ پھر بڑی کوشش سے وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ اپنے چاروں طرف متعجب ہو کر اِس طرح دیکھا جیسے کوئی بچہ متحیّر ہو کر دیکھتا ہے۔ ہاتھ پھیلا کر تین قدم لڑکھڑا کر چلا اور پھر بیجان ڈھیر کی طرح زمین پر لوٹ ہو گیا، جیسے کسی نے کلہاڑی سے اُسے ہلاک کر دیا ہو۔

تماشائیوں میں سے ایک نے نٹ کے سینے پر اپنا کان لگایا۔ پھر اُٹھکر کہنے لگا:۔

"اس کا دل رُک گیا۔ یہ تو مُردہ ہی"

پھر ایکا ایکی کسی خیال سے ڈر کر اُچھل ایک طرف کو جا کھڑا ہوا اور خوفزدہ ہوکر ہلکی آواز میں بولا "طاعون سے مرا ہی۔ یہ ہماری بستی میں اپنے ساتھ طاعون لایا ہی"

ایک خوفزدہ سرگوشی سارے مجمع میں دوڑ گئی:۔

"طاعون! کالی بیماری!"

ایک طالب علم نے آگے بڑھکر کہا "نہیں لوگو۔ آخری چھلانگ لگانے میں اس غریب نے اتنا زور لگایا کہ اس کا دل پھٹ گیا۔ یہ طاعون نہیں ہی، دیکھو!" یہ کہہ کر اُس نے نٹ کے سینے پر سے اس کا سنہرا لباس پھاڑا۔ پھر وہ اس طرح چونک کر پیچھے ہٹا جیسے کوئی سانپ اُس پر جھپٹا ہو۔ اس کا چہرہ بھی اُسی قدر سفید پڑ گیا تھا جتنا کہ مُردہ نٹ کا۔

کیونکہ نٹ کے سینے پر ہیبت کی مُہر ثبت ہوئی نظر آئی۔ چھوٹے چھوٹے اُودے چٹّے تھے جن کی تردید میں طالب علم کی منطق کوئی دلیل پیش نہیں کرسکتی تھی اور نہ کوئی انسان انہیں مٹا سکتا تھا۔

مجمع چُپکے چُپکے جلدی سے منتشر ہو گیا۔ لوگ پلٹ پلٹ کر خائف نظروں سے نٹ کی لاش کو دیکھتے جاتے تھے۔ نٹ کی طاقت ہمیشہ کے لئے سلب ہوچکی تھی اور اُسکی ننھی سی لڑکی جس کا لباس پریوں کا سا تھا اُسکے بیجان سینے پر بڑی چیخیں مار رہی تھی اور

بندر اُس کے سر کے پاس بیٹھا قیر قیر کر رہا تھا۔

میلے کی وادی میں یہ خبرِ بد بجلی کی طرح پھیلتی گئی جیسے کہ سب بُری خبریں جادو رفتاری سے پھیلتی ہیں۔ اِسی اثنا میں ایک مہین اور کرخت آواز نے گھبراتے ہوئے وسیع مجمع کو اپنی طرف ایک لمحہ کے لئے متوجہ کر لیا۔ یہ آواز گڑبڑ اور شور وغل میں صاف سُنائی دی۔

یہ کرخت آواز بوڑھی نیک نام کی تھی جو اُس وقت سیدھی کھڑی تھی اور اُس کا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا ہوا تھا۔

"دیکھو، اُوپر دیکھو۔ ابلیس تمہیں اُوپر سے دیکھ رہا ہے۔ دیکھو! ——— وہ اُوپر آسمان میں تمہارے سروں کے اُوپر ابلیس روڈا میں آگیا ہے۔ یہ وہی ہے، وہی ہے، دیکھو! عاشقوں کی طرح اُس نے اپنا آغوش سب کے لئے پھیلا رکھا ہے۔" یہ کہہ کر اُس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور اِس طرح ہنسی جیسے ہچکیاں لے لیکر کوئی رو رہا ہو۔

اُن لوگوں کو جنہوں نے ٹھہر کر اُس کے ہاتھ کے اشارے کی جانب دیکھا تو انہیں فی الحقیقت ایک بدشگون اور منحوس منظر نظر آیا۔ ایک سیاہ بادل نے اب سارے آسمان کو جذب کر لیا تھا۔ اس کے کناروں پر کچھ ایسی سبز روشنی نظر آرہی تھی جو اہلِ زمین نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس بادل کے دونوں طرف سیاہ اُودا ہٹ لئے ہوئے بادل کا ایک ایک لمبا ٹکڑا دکھائی دیتا تھا۔ دو یہ ٹکڑے

ایسے معلوم ہوتے تھے کہ دو زبردست اور بھیانک ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں اور اُن کے بیچ میں اُوپر کے رُخ ایک چپٹا اور موٹا سا بادل تھا۔ اس کی شکل سر جیسی تھی۔ جس پر دو چھوٹے چھوٹے نکیلے سینگ اُبھرے ہوئے تھے۔ بادل کی شکل تیزی سے بدل گئی۔ ہاتھ پھیل گئے اور اتنے لمبے ہو گئے گویا روئے زمین اور اسکے سب کچھ کو اپنے آغوش میں لے لینا چاہتے ہیں۔

دوسرا باب

خوبصورت شہر روڈا میں طاعون پھیلے مشکل سے ایک ہفتہ ہوا ہوگا مگر ان چند دنوں میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا تھا۔ اب یہ شہر بشاش مسکراہٹوں سے پُر نہ تھا۔ مسرور زندگی اور یہاں کی کیفیتِ نشاط اب معدوم ہوچکی تھی۔ اگر کوئی غنیم اس شہر کو پورے سال بھر تک گھیرے رہتا اور برابر حملے کئے جاتا تب بھی اتنا نمایاں تباہ کن نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ دشمن جو یہاں کے باشندوں کو غارت کر رہا تھا انہی کے درمیان موجود تھا، ان کی نظروں سے پوشیدہ وہ ہر وقت ان پر داؤ گھات کرتا رہتا تھا اور خاموشی سے چپکے چپکے انہیں ہلاک کر رہا تھا۔

اس دشمن کا سانس زہریلا تھا اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں انہیں موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔

بازاروں اور چوراہوں میں اب لوگ جمع ہوکر خوش گپیاں نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی مجمع نظر بھی آتا تھا تو یہ اُن خاموش لوگوں کا ہوتا تھا جو اپنے مُردوں کو ڈھوتے تھے۔ جو لوگ کسی ضرورت سے باہر نکلتے تھے۔ تیز تیز قدم اُٹھاتے تھے۔

خائف ہو ہو کر اپنے کندھوں پر سے بار بار نظریں دوڑا کر دیکھتے جاتے تھے گویا بھیانک موت سے بچ بچ کر چل رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موت اُن پر جھپٹ کر اپنی انگلی اُنکے لبوں پر رکھدے۔

کلیساؤں میں دفع طاعون کی دعائیں مسلسل مانگی جاتی تھیں۔ آتشدانوں میں گندھک اور کوئلے دن رات ہر بازار میں سُلگتے رہتے تھے۔ اس دل سوز کوشش میں کہ دبا ٹل جائے۔ پادری اور واعظ گھر گھر پھرتے تھے۔ یا اگر میدانوں میں کوئی مجمع نظر آتا تو اُس میں پہونچ جاتے اور اُنہیں روزے رکھنے اور عبادت کرنے کی تلقین کرتے، اپنے گناہوں پر نادم اور غلط کاریوں سے تائب ہونے کو کہتے۔ کیونکہ یہ عذاب انہیں کی سزا میں نازل ہوا تھا اور کہتے تھے کہ خدا سے دُعا مانگو کہ اِس عذاب کو اِس شہر سے اُٹھائے۔

مگر ساری دُعائیں اور التجائیں بے اثر و بے کار ثابت ہوئیں۔ موت کا سیاہ پھول کھلا اور پھلتا پھولتا رہا۔ ہر طرف تباہی و بربادی کی حکومت تھی۔ لوگوں کی ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں۔ تنہائی میں اُنہیں خود اپنے خیالات سے ڈر لگنے لگا تھا اور اس سے بچنے کے لئے انہوں نے پھر بازاروں میں جمع ہونا شروع کر دیا تاکہ اپنے دُکھ درد ایک دوسرے کو سُنائیں، اور افواہوں پر رائے زنی کریں اور اُن تمام بھولی بسری دواؤں پر غور کریں جو اُنکے آباؤ اجداد طاعون سے مقابلہ کرنے میں استعمال کرتے تھے۔

جب کبھی کوئی پادری یا واعظ نظر آتا تو اُس کے پیچھے پیچھے ایک بڑا مجمع ہوتا اور جب وہ ان سے کچھ کہتا تو یہ لوگ اپنے گھٹنوں پر جُھک جاتے۔ اور اس کی صلیب کو چُومنے کے لئے اُس پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ کیونکہ موت ہر گھر میں براج رہی تھی۔ امیر اور غریب دونوں یکساں طور پر مر رہے تھے۔ مضبوط اور شہ زور نوجوان اور کنواری لڑکیاں جو اپنی جوانی کی ترنگ میں تھیں، اور کڑیل جوان جن کی نبضوں میں زندگی دھڑک رہی تھی وہ بھی کمزور و اپاہج لوگوں کی طرح کھڑے کھڑے گرتے اور دم دے دیتے۔

معلوم ہوتا تھا کہ روڈا میں اُمید مٹ چکی ہے لیکن صرف ایک نام ایسا تھا جو سب کے لبوں پر اکثر آتا تھا۔ اور اس طرح کہ گویا وہی ان سب کو نجات دلا سکتا تھا۔ یہ نام تھا معلّم و طبیب فاؤسٹ کا۔

سارے شہر والے فاؤسٹ کو جانتے تھے۔ سیاہ چُغہ، گلے اور چوڑے چوڑے کفوں پر بھورے رنگ کے سمور کا حاشیہ لگا ہوا، چپٹی سیاہ مخمل کی عالموں جیسی ٹوپی اور لمبا گرہ در گرہ عصا۔ یہ سب چیزیں ایسی تھیں جنہیں شہر والے خوب پہچانتے تھے۔ بڑا نورانی اور رُعب داب کا چہرہ تھا۔ اس کی فراست و خوش اخلاقی کا شُہرہ تھا۔ بڑی ساری سفید ڈاڑھی ناف تک پہونچتی تھی۔ سفید سفید لٹوں کے پس منظر میں یہ چہرہ غایت درجہ لائق احترام نظر آتا تھا اور اس پر غم کی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اُسکی آنکھوں سے غمگینی و سنجیدگی ٹپکتی تھی لیکن

اِن میں ایک خاص روشنی کی چمک تھی۔ یہ روشنی اس شعلے کا پتہ دیتی تھی۔ جو اُس کے دل میں روشن تھا یعنی اُس کا واحد جذبۂ علم۔ انسان کی عمر طبعی سے وہ کبھی کا گذر چکا تھا لیکن تحقیق و اکتشاف کا مادّہ اس میں اب بھی اسی طرح جوان تھا جس طرح اس وقت تھا۔ جب وہ پیدوا اور ویمر کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلا تھا۔ اُس کا گھر شاہراہ سے ہٹ کر تھا۔ دروازے تک پہونچنے کے لئے پہلے بہت سی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں، یہاں اپنے نیچی چھت والے کمرے میں وہ مطالعہ اور تجربوں میں منہمک رہتا تھا۔ اور اس دُھن میں لگا رہتا تھا کہ فطرت کی بند مٹھی میں سے گہرے گہرے راز چھین لے۔ علم آموزی کے شوق میں اُس نے سارے یورپ کا سفر کیا تھا اور طب، فلسفہ، الٰہیات اور الکیمیا کے علوم سیکھے تھے، ایک زمانے میں اُسے علومِ تاریک کا بھی شوق ہوا تھا۔ سحر، ہاتھ باچھنا، جادو، بلّوزینی بھی اُس نے سیکھی تھی۔ مگر یہ اُس کی جوانی کا ذکر ہے اور ان فنونِ تاریک کو وہ کبھی کا چھوڑ چکا تھا کیونکہ یہ علوم تعلیماتِ مذہب کے خلاف تھے۔ کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک طرح طرح کے آلاتِ تجربہ رکھے تھے۔ شیشے کی ٹیڑھی میڑھی نلیاں، عجیب عجیب وضع کی بوتلیں اور کشید کرنے کے بھبکے۔ برنز کے گیروں میں بلّور کی گیندیں اور شیشے کے گولے لگے تھے۔ دیواروں پر کچھ عجیب بے ترتیبی سے موم جاموں پر بنی تصویریں آویزاں تھیں۔ ان میں چند علمِ تشریح کی تصویریں تھیں کہیں پنج گوشہ ستارے بنے تھے۔ چند نجوم کے نقشے تھے، ایک خاکہ کائنات کا تھا

جس کے وسط میں انسان دکھایا گیا تھا۔ یہ دو دائروں میں گھرا ہوا تھا اور ہیئت کی شکلوں سے اسے تقسیم کیا گیا تھا۔

لیکن اس کمرے میں جو چیز سب سے نمایاں تھی وہ کتابیں تھیں۔ یہ ہر جگہ الماریوں میں چُنی ہوئی تھیں۔ فرش پر اُن کے بڑے بڑے ڈھیر لگے تھے اور ہر کونے میں رکھی تھیں۔ سارا کمرہ ان سے پٹا پڑا تھا۔ اُن میں ہر شکل اور ہر ضخامت کی کتاب تھی۔ جلدوں کی بھی اتنی قسمیں تھیں کہ ان سے زیادہ کا تصوّر مشکل ہے۔ کچّے چمڑے، عمدہ رنگے ہوئے ملائم چمڑے، لکڑی، اور سانپ کی کھال کی جلدیں تھیں۔ اور ایک تو ایسی تھی کہ اُسے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا، یہ جلد انسان کے چمڑے کی تھی کسی قاتل کی جسے پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔

یہ کتابیں گویا فاؤسٹ کے بچے تھے۔ اُس کا سارا فرصت کا وقت ان میں صرف ہوتا تھا، اس خیال سے کہ کہیں کوئی نئی بات معلوم ہو جائے اور تشنگیِ علم سیراب ہو۔ یا کوئی گہرا خیال مِل جائے جس پر غور و خوض کرنے سے کوئی جدید بات نکل آئے، ایسی کہ فلاح و بہبودیِ انسان کے لئے صرف کی جا سکے۔ کیونکہ فاؤسٹ اُن بے مثل ہستیوں میں سے تھا جن کو تجسّسِ علمی نے انسانیت سے خارج نہیں کر دیا تھا۔ اس میں اب بھی عقیدہ و تقویٰ شدّت سے موجود تھا۔ اور تجربہ بسیط نے اس کے جذبۂ محبّتِ انسانیت کو فنا نہیں کیا تھا۔

فاؤسٹ اُس زندگی میں بہت دلچسپی لیتا تھا جو اُس کے چاروں طرف

تیزی سے گردش کر رہی تھی۔ روزمرہ کے واقعات جو آئے دن اُس کی نظر سے گذرتے رہتے تھے، اُن کے مشاہدے میں اُسے بہت لُطف آتا تھا۔ لوگ فاؤسٹ سے ہمیشہ مشورہ لیا کرتے تھے۔ اور وہ اِن سب کا رازدار بن گیا تھا جن سے اُس کی جان پہچان تھی۔ سب آکر اُس کے سامنے اعتراف کر لیا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اس کی عقلمندی اور وسیع علمیت پر اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے اور اس کے احترامِ انسانیت کی وجہ سے اِس سے محبّت کرتے تھے۔

اپنے شہر میں یکایک جو وبا پھیلی تھی اس سے فاؤسٹ اس درجہ متاثر ہوا کہ اُس نے اپنے سارے کام اور دلچسپ مشغلے چھوڑ دئے اور ساری توجہ اس پر مرکوز کر دی۔ کہ اس وبا کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکے اور اُس خوف کو زائل کرے جو شہر کے ہر گلی کوچے میں شدّت کے ساتھ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔

پورے ایک ہفتے سے فاؤسٹ دفع طاعون کی دوا معلوم کرنے میں منہمک تھا۔ اور اس وقت اپنے تجربے کے اختتام پر تھا، بھاپ ٹھنڈی ہو کر ایک شیشے کے برتن میں مُقطّر ہو رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک بڑی سی انجیل کھُلی ہوئی تھی اور ایک حمد اس وقت اس کے پیشِ نظر تھی جسے پڑھ پڑھ کر وہ اپنی رُوح کو تازہ کرنا چاہتا تھا اور اس طرح تجربہ کے طویل وقفے اُس کے لئے اجیرن نہ بنتے تھے۔

اُس نے اپنے دل سے کہا۔ "اللہ میری مدد کرے گا کیونکہ طاعون خُدا نے نازل نہیں کیا ہے بلکہ یہ کام ابلیسِ لعین کا ہے۔"

فاؤسٹ نے اپنی ریت گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر بغور اُن بھورے رنگ کے انجرات کو دیکھا جو ٹھنڈے ہوکر قطروں کی صورت میں جمع ہوتے جارہے تھے۔

پھر آپ ہی آپ بولا۔ "کام ختم ہوا۔"

پھر بھبکے سے نلی الگ کی اور قیمتی عرق کی بلّوری صراحی کو کپکپاتے ہاتھوں سے اٹھاکر روشنی کے رُخ کرکے دیکھا۔

اس کا رنگ گہرا بھورا تھا اور سورج کی روشنی جب اس میں سے گزری تو وہ کُندن کی طرح دمکنے لگا۔ گرم ہونے کی وجہ سے اب تک اس میں ننھے ننھے سے بُلبُلے اُٹھ رہے تھے۔

فاؤسٹ نے بہ آوازِ بلند کہا۔ "یا اللہ اس کارِ نجات میں برکت دے۔ صرف تو ہی ہماری مدد کرسکتا ہے۔" پھر بلوری صراحی کو اُوپر اٹھایا۔ برابر کی الماری میں سے کئی شیشیاں نکالیں اور اُن کو اس عرق سے جو ابھی تک گرم تھا بھر بھر کر رکھتا گیا۔

آخری شیشی کی ڈاٹ لگاتے ہوئے بولا۔ "اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں بچائے۔"

اُس وقت اُس کے دروازے کی سیڑھیوں پر کسی کے جلدی جلدی چڑھنے کی آواز سُنائی دی۔ پھر گھبرا کر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور تیز اور پھولے ہوئے سانس کی آواز آئی۔ فاؤسٹ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک زرد چہرے اور بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی گرتی پڑتی کمرے میں داخل ہوئی ننگے پاؤں ہانپتی کانپتی

اور دُور دُور سے بھاگ کر آنے کی وجہ سے خستہ حال۔ کپڑے پھٹے پُرانے تھے اور راتوں کو جاگنے کی وجہ سے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار تھے۔ رُخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور اس حالت میں وہ فاوسٹ کی طرف چیختی چلاتی دوڑی:۔

"بچاؤ! بچاؤ! میری ماں مر رہی ہے!"

فاوسٹ نے پوچھا "تمہاری ماں وہی ہے نا جو چوراہے پر پھول بیچتی ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ وہی ہے!"

"اور وہ بیمار کب سے ہے؟"

"آج تیسرا دن ہے۔ طاعون تو نہیں ہے نا اُسے فاوسٹ؟"

لڑکی نے کچھ اس التجا سے یہ بات کہی کہ گویا اُس کی ماں کی قسمت کا دارومدار فاوسٹ کے جواب پر تھا۔

فاوسٹ نے افسوس سے کہا "کون کہہ سکتا ہے۔ بعض دفعہ طاعون میں آدمی فوراً چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابلیس اپنے شکار کے ساتھ دنوں کھیلتا رہتا ہے۔ مگر تم پریشان نہ ہو" فاوسٹ نے لڑکی کی آنکھوں میں مایوسی کی جھلک دیکھ کر جلدی سے ڈھارس بندھانے کو کہا "میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ یہ دیکھو اس شیشی میں ایک دوا ہے جو خُدا کی ہدایت سے میں نے بنائی ہے۔ اُس کے رحم و کرم سے تمہاری ماں بچ جائے گی اور ابلیس کو شکست ہوگی۔ آؤ میری بچی مجھے اپنے گھر کا راستہ بتاؤ۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹی، ایک ہاتھ تعجب سے اُٹھا ہوا تھا اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک دم سے اُس کا خوف جاتا رہا اور چہرے پر خوشی کی جھلک پیدا ہوئی۔ لب سے لب جُدا ہوا اور اپنے آنسوؤں میں سے وہ مُسکرانے لگی۔ بے خیالی میں خود بخود آگے جُھکی اور فاؤسٹ کے ہاتھوں کو چُوم کر اُنہیں خوشی کے آنسوؤں سے تر کر دیا۔

تیسرا باب

وہ کمرہ جس میں فاؤسٹ اب داخل ہوا نیچی چھت کا اور تنگ و تاریک تھا۔ یہ شہر کی سب سے غریب آبادی میں تھا۔

اس کی ہر چیز غربت و افلاس کا اعلان کر رہی تھی۔ سامان بہت کم تھا۔ ایک میز، دو کرسیاں، چند برتن، اور قلعی دار پتیلیاں ایک طرف سلیقے سے رکھی تھیں۔ ایک نیچے سے جھلنگے نے آدھا کمرہ گھیر رکھا تھا۔ اس میں ایک عورت سیدھی اور بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی جلد کی چمک مدھم پڑ چکی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے پر کھال منڈھ دی گئی ہے۔ فاؤسٹ تو اُسے دیکھ کر پہلے یہ سمجھا کہ وہ مر چکی ہے لیکن جب اس کا دل ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی دل کی حرکت سلب نہیں ہوئی ہے۔

لڑکی نے کہا "صبح سے اسی طرح بے سُدھ پڑی ہوئی ہیں۔ نہ کچھ بولتی ہیں نہ ہلتی جُلتی ہیں"

فاؤسٹ اُس کی پٹی کے پاس بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ مریضہ کی کمر میں ڈال کر اُسے اُٹھایا

اور غور سے اُس کی آنکھوں کو دیکھا۔ اس میں زندگی کے آثار اب بھی ظاہر نہ ہوئے۔

فاؤسٹ نے لڑکی سے کہا۔ "مجھے ایک پیالی لا دو۔"

لڑکی نے پیالی لا کر دی اور فاؤسٹ کی مسیحائی پر یقین کر کے اُس کی آنکھیں اُمید سے روشن ہو گئیں۔

فاؤسٹ نے اپنی تھیلی میں سے شیشی نکالی اور ڈاٹ کھول کر دس قطرے پیالی میں ٹپکائے اور بولا "تھوڑا سا پانی لاؤ۔"

لڑکی پانی لے آئی اور اُس نے دوا میں پانی ڈال کر آدھی پیالی بھر دی۔ اس پیالی کو اُس عورت کے لبوں سے لگا دیا۔ مگر دانتی جم گئی تھی۔ اُس کا مُنہ زبردستی کھولا اور تھوڑا سا پیچھے جُھکا کر اس کے حلق میں دوا ٹپکا دی۔

فاؤسٹ اُسے پکڑے رہا اور اُس کی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ لڑکی آگے جُھکی ہوئی سانس تک روک کر بیٹھی رہی تھی اور انتظار میں ہاتھ مل رہی تھی۔ پہلے پہل تو کوئی علامت ایسی ظاہر نہیں ہوئی کہ دوا نے کوئی اثر کیا یا نہیں۔ پھر فاؤسٹ نے لڑکی کو متوجہ کرنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی ماں نے آہستگی سے اپنا سر ایک طرف کو پھیرا اور اتنی ہی آہستگی سے اُس کی آنکھیں کُھلیں اور اُس کی جمی ہوئی بتّیسی کُھل گئی۔ اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور ہوش کی ایک ہلکی سی جھلک اُس کے چہرے پر دکھائی دی۔

"اماں! اماں!" لڑکی نے سرگوشی کی سی ہلکی آواز میں کہا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں زور

پڑنے سے اُس کا رشتۂ حیات ٹوٹ نہ جائے۔

ماں نے اپنے ہاتھ پھیلائے گویا سنبھلنے کے لئے وہ کسی چیز کا سہارا ڈھونڈ رہی ہو۔ اُس کی آنکھیں دُور جمی ہوئی تھیں۔ اس کے لب اس طرح جُدا ہو گئے جیسے کسی نظر نہ آنے والی ہستی سے باتیں کر رہی ہو اور ایک خفیف غم آلود مسکراہٹ نے اس کے چہرے کے خدوخال ملائم کر دئے۔ پھر ایکا ایکی ایک خوفناک تبدیلی ہوئی۔ اس کے چہرے کی روشنی گُل ہو گئی۔ پتھر جیسے سخت نقوش پھر اُبھر آئے۔ جبڑا کھل گیا اور ہیجانی کیفیت میں کچھ اس طرح تڑپی کہ فاؤسٹ کی گرفت سے نکل گئی اور جھلنگے پر اس طرح گر کر ڈھیر ہو گئی کہ اُس کے بال کُھلکر فرش پر لٹک گئے۔

"امّاں! امّاں! اچھی! ایسا نہ کرو!" لڑکی چیختی ہوئی اُس کی طرف دوڑی مگر دس ہزار آوازیں بھی اب اُس کو نہ اُٹھا سکتی تھیں۔ طاعون کا تریاق، فاؤسٹ کی فراست وکشف کا نتیجہ، اس کی نیک وصالح کوششوں کا پھل، اپنے ہمجنسوں کو مصیبت سے نجات دلانے کی اُمیدوں کا سہارا، سب کچھ خاک میں مل گیا۔ زندگی کے پوشیدہ مرکزوں پر اُس نے اثر کیا۔ بُجھی ہوئی چنگاری کو ہوا دے کر اُس نے بھڑکا دیا جس نے جسدِ خاکی کو پھونک کر خاکستر کر دیا۔

"امّاں! امّاں! اچھی مجھے اکیلا مت چھوڑو، یا اللہ! میری امّاں نہ مریں"

مگر اے بچّی۔ ماں تیری آواز نہیں سُن سکتی۔ وہ تیری آواز کی اب کبھی پروا نہیں کرے گی۔ نہ تجھے چُمکاریگی اور نہ پیار کرے گی، نہ تجھے گا کر خوش کرے گی اور نہ

محنت مزدوری کرکے تیرا پیٹ پالے گی۔

فاؤسٹ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اور اس کے اعصاب کھنچ رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں کبھی مُردہ عورت کو گھور رہی تھیں اور کبھی بچّی کو۔

"خُدا، اگر کوئی خُدا ہے تو، بالکل بے بس ہے۔ زمین کے کمزور بچّوں کو وہ اس طرح اذیت نہیں پہونچا سکتا۔ علم ایک دھوکہ ہے۔ ابلیس قادرِ مطلق ہے"

یہ الفاظ اُس نے ایک خوفناک سرگوشی میں غصّے سے کہے۔ جذبات کے طوفان نے اُسے ہلا ڈالا۔ غیظ و غضب کی ایسی شدّت اُس نے جوانی کے گرم خون میں بھی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ دوا کے ناکامیاب رہنے اور اپنے عزیز ہم وطنوں کی تکلیف و موت کے خیال نے امدادِ غیبی کے اعتقاد کو کچلکر ریزہ ریزہ کردیا۔

اُس نے شیشی کو اُٹھا کر پورے ہاتھ کی طاقت سے زمین پر دے مارا اور ہانپ کر بولا "وہ پڑا عقیدہ۔ وہ پڑا اعتقادِ علم۔ جُھوٹ ہی ہاں سب جھوٹ ہی"

اور پھر مُردہ عورت اور اُس کی بلکتی بچّی کو بغیر دیکھے وہ اس طرح گلی میں نکل کر بھاگا جیسے کوئی دیوانہ ہو۔

چوتھا باب

کچھ دیر تک فاؤسٹ لمبی لمبی ڈگیں بھرتا چلا گیا اور غصہ سے اپنا عصا زمین پر مارتا گیا۔ وہ تیز چل رہا تھا مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ علم کی شکست فاش اور اپنی ہزیمت پر اُس کے ہوش وحواس پراگندہ ہو گئے تھے۔ دلی آرزوؤں کی تباہی نے خدائے الرحم الراحمین کے عقیدے کو مسمار کر دیا تھا۔

جب صدمے کی شدّت کچھ کم ہوئی تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ شہر کے سب سے آباد بازاروں میں سے گذر رہا ہے اور یہ بازار اب اور بھی زیادہ آباد ہو گئے تھے، کیونکہ خوفناک وبا کی وجہ سے لوگ اکثر بازاروں میں جمع ہوجایا کرتے تھے۔

اہلِ کلیسا لمبے لمبے چُغے اور اُونچی اُونچی ٹوپیاں پہنے جن کے گھیر اُن کے کندھوں تک اِس لئے پھیلے تھے کہ وبا اُن سے دُور رہے، ایک قطار میں گزرتے نظر آ رہے تھے۔ اُن کے مُنہ بھی ڈھکے ہوتے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں لٹکنے والی پیتل کی انگیٹھیاں تھیں جن میں جڑی بُوٹیاں، گندھک اور رال کی دھونیاں تھیں۔ بڑے چوراہے اور گرجا کے باہر چھوٹے چھوٹے کئی جتھے تھے۔ یہ

لوگ نیم جان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ جنون کی حالت میں خدا کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور بعض وفورِ عبودیت کا اظہار کر رہے تھے۔ فاؤسٹ کی طبیعت کو اب بہت سکون ہو گیا تھا۔ اُس نے اِن لوگوں کو ترس کی نگاہ سے دیکھا اور پھر اُسے مرنیوالی عورت اور انسانی بیچارگی کا خیال آیا۔

تقریباً ہر گلی کے موڑ پر یا تو کوئی پادری موجود تھا یا واعظ جو چیخ چیخکر پیشین گوئیاں کر رہا تھا کہ اگر لوگوں نے توبہ استغفار نہ کیا اور خُدا کی بندگی نہ کی تو اور بھی تباہی و بربادی ہوگی۔

ان میں سے ایک چیخکر بولا۔ "روزے رکھو اور عبادت کرو۔ قیامت کا دن قریب آپہونچا۔ اقرارِ تاسف و ندامت کرو۔ اور اپنی غیر فانی روحوں کو بچاؤ۔"

اِس کے گرد ایک بڑا مجمع تھا۔ سب کے سب اُس پر ٹوٹ پڑے کہ جو صلیب اس کے ہاتھ میں تھی اُسے بوسہ دیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ایسا کرنے سے کوئی بچانیوالی قوت صلیب میں سے نکل کر اُن میں آجائے گی۔

فاؤسٹ اب آہستہ آہستہ چلنے لگا تھا اور اپنی ساری زندگی پر غم و افسوس کر رہا تھا کہ تجسس علم میں رائیگاں گئی۔ ایسے علم کے حصول میں اکارت گئی جو پہلے ہی ضرورت کے موقع پر اپنے اور اپنے ہمجنسوں کے لئے قطعاً بیکار ثابت ہوا۔

وہ ایک واعظ کے قریب سے گذرا۔ اس کا لباس راہبوں کا سا تھا۔ اُس کے گرد ایک بھیڑ خوش اعتقاد لوگوں کی لگی تھی۔ راہب کی کرخت آواز، اُسکی جوشِ مذہب

بھری ہوئی آنکھیں، لوگوں کو گنا ہگار و مجرم ٹھہرانے کا لہجہ اور غضبناک طریقۂ گفتگو دیکھ کر فاؤسٹ بھی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

راہب کی آواز گونجی "تم نے گناہ کئے ہیں اور خدا گنا ہگاروں کو سزا دیتا ہے"۔

اتنے ہی میں ایک موڑ پر سے ایک اور آواز سُنائی دی۔ جو اس سے بھی زیادہ بھیانک معلوم ہوئی ـــــ یہ آواز ایسی تھی کہ اسے جس کسی نے سُنا لرز گیا اور خوف سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگا۔ یہ آواز تھی خوشی اور قہقہوں کی۔ نوجوانوں اور لڑکیوں کے قہقہوں کی آواز جو گرجا کے خلا میں گونج رہی تھی۔ یہ آواز قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ راہب کی آواز اس میں جذب ہو کر رہ گئی۔ پھر ایک دم سے ایک مختصر سا جلوس نوجوانوں کا راستے کے موڑ پر سے ہنستا گاتا اور ناچتا گُذرا۔

یہ لوگ مست نظر آتے تھے۔ مگر شراب خوری سے نہیں۔ وہ انتہائی مسرت میں ناچ رہے تھے، گا رہے تھے اور خوب زور زور کے قہقہے لگا رہے تھے۔ گویا موت کو جوانی للکار رہی تھی۔

جب یہ جلوس راہب کے قریب سے گُذرا تو اُس نے خوفناک آنکھوں سے اُسے گھُورا اور اپنے دانت پیسنے لگا۔ اپنا دُبلا سوکھا سا ہاتھ اُن کی طرف اُٹھا کر اُس نے تھُوکا اور پھر چیخ کر بولا:۔

"ارے بے ایمانو۔ مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ"۔

تین رقص کرنے والی لڑکیوں نے جنکے ہاتھ میں ہاتھ پڑے ہوئے تھے اُس کو تیکھی چتون سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں غیر فطری روشنی کی چمک تھی گویا ایک آگ دہک رہی تھی، جس میں وہ اپنی ساری جوانی کو جھونک دینا چاہتی تھیں اور اس جنونی سرخوشی میں آج ہی کی شب اپنی زندگی ختم کر دینا چاہتی تھیں۔

ان میں سے ایک نے راہب کی طرف ایک پھول پھینکا اور خوب ٹھٹّا مار کر ہنسی اور بولی:۔

"اگر کل موت ہے تو آج عیش ہو"

پھر ناچنے والوں کا ایک ریلا آیا اور یہ لڑکیاں اس میں غائب ہو گئیں۔

راہب کی آواز پھر سنائی دی:۔

"وہ جو ایمان رکھتا ہے زندہ رہیگا۔ لیکن وہ جو خُدا کا مذاق اُڑائیگا غارت ہو جائے گا۔"

وہ ایک ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے اُوپر دیکھتا رہا۔ ایکا ایکی اُس کا جسم سخت ہو گیا، اور ہاتھوں کی اُنگلیاں اس طرح پھیل گئیں گویا کسی زبردست چیز سے بچنا چاہتا ہے۔ چہرے سے انتہائی نفرت وخوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر کسی جانور کی طرح چیخ مار کر وہ چکراتا ہوا سر کے بل گرا۔ لوگ گھبرا کر تتر بتر ہو گئے اور ڈر ڈر کر کہنے لگے:۔

"طاعون! طاعون! خُدا کے عابد بھی طاعون سے نہ بچ سکے۔"

لیکن یہ طاعون نہیں تھا۔ کیونکہ فاؤسٹ نے جھپٹ کر اُسے اپنی گود میں اُٹھایا۔

طاعون کی نفرت انگیز علامات اُسے کہیں دکھائی نہ دیں۔ راہب پر کوئی مہلک دورہ پڑا تھا اور اس کی زندگی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور پاگلوں کی طرح فاؤسٹ کو دیکھکر تکلیف سے چیخا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور مرتے مرتے فاؤسٹ نے اُسے کہتے سُنا:۔

"ابلیس! یہ کام ابلیس کا تھا۔ اُوپر آسمان پر"

اُوپر نظر کی تو فاؤسٹ نے دیکھا کہ ایک بڑا سیاہ بادل ہے اور اُس کے دونوں طرف دو لمبے لمبے بادل کے ٹکڑے ہیں جن کی شکل پھیلے ہوئے ہاتھوں کی سی ہے اور بیچ میں ایک چپٹا سا سیاہ سر ہے جس میں سے دو نکیلے سینگ نکلے ہوئے ہیں۔

پانچواں باب

اپنے چاروں طرف مصائبِ انسانی اور بیچارگی و بےبسی دیکھکر فاؤسٹ کا دل بیٹھ گیا تھا۔ اپنی ساری زندگی کے ضائع ہونے کا اُسے صدمہ تھا اور مستقبل کی بےسُود زندگی پر بھی وہ متاسف تھا۔ اِسی سوچ میں جب وہ اپنے گھر کے نزدیک پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ سیڑھیوں پر کئی مرد اور عورتیں اُسکے انتظار میں کھڑی ہیں۔

جب وہ اپنی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا تو سب اُس کے گرد جمع ہونے لگے اور اُسکے چُغے کو پکڑ پکڑ کر اُس سے التجا کرنے لگے۔

"فاؤسٹ۔ اچھے فاؤسٹ۔ میری مدد کر۔ میرا اکلوتا بچّہ ــــــ"

"فاؤسٹ ہم پر ترس کھا۔ سوائے تیرے ہمیں اور کوئی نہیں بچا سکتا"

"فاؤسٹ نے سیڑھیاں ختم کرنے کے بعد پلٹ کر اُن کی طرف رحم آمیز نگاہوں سے دیکھا اور بولا:۔

"یہاں سے چلے جاؤ۔ عقیدہ مر گیا! علم بالکل بیکار ہے! میرے غریب لوگو میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ ہم سب عذاب میں گرفتار ہیں"

یہ کہا اور سر جُھکا کر اپنے گھر میں داخل ہوگیا اور لوگ آپس میں حیرت سے چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ یہ فاؤسٹ کو کیا ہو گیا کہ اس قدر بدل گیا۔

فاؤسٹ نے اپنے مشترک دارالمطالعہ اور دارالعمل کو نفرت اور حقارت سے دیکھا۔ ان سب کتابوں کی اب اُس کے نزدیک کوئی وقعت نہیں تھی۔ اُن کے صفحات میں اُس کے لئے آئندہ نہ تو سکون تھا اور نہ الہامی تحریک۔ طبی کتابوں اور مسودوں کے ڈھیر کیمیا وغیرہ کی جلدیں اور سحرابیض کی سب کتابیں اُس کے لئے ناکارہ ثابت ہوتی تھیں وہ سب چیزیں جو اُسے کبھی عزیز تھیں اب اُن پر اس کا اعتقاد بالکل مٹ چکا تھا۔ اُسے اب خود اپنی ذات پر اعتقاد نہ رہا تھا۔

وہ اُن آلات کے قریب گیا جن میں اُس نے عرقِ طاعون کشید کیا تھا اور جو اس قدر بے اثر ثابت ہوا تھا جس کی تیاری میں نگرانی کرتے کرتے اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں مگر دل میں اُمید کامیابی تھی اور یہ اُمید اب اس بُری طرح غلط ثابت ہوئی۔ قریب جا کر اُسے نفرت سے دیکھکر بولا:۔

"اے باریک نلیو اور بلّور کی گیندو، مُرکّب سفوفو اور مشرق کے سحر آفریں شربتو۔ اور تو بھی اے فاؤسٹ۔ کیا ہم سب ملکر ابلیس کی قوت کو شکست دے سکتے ہیں؟ میں! ہاہا!"

اور اُسکی ہنسی ایسی تھی جیسے تکلیف کی چیخ۔

"خُدا پر بھروسہ! ہاہاہا! کوئی پرندہ پر نہیں مارتا جب تک ــــ آہ! سمجھ میں نہ آنے

والا فلسفہ! آہ! علم وطب کی کہانیوں کی قوتو! آؤ میں تمہاری قوت کا تجربہ کروں۔ شیشہ! شیشہ! شیشہ! سب کمزور ٹوٹ جانیوالا شیشہ! بیحد کمزور شیشہ!"

اس نے اپنا عصا اُٹھایا اور نلیوں اور آلات کشید پر مارا، پھر مارا اور اتنی دفعہ مارا کہ فرش اور میزیں شیشے کی کرچوں اور ریزوں سے بھر گئیں۔ دھات کی بنی ہوئی چیزیں ٹیڑھی میڑھی ہو گئیں۔ زندگی بھر کی محنت کے نتائج جو صبر و سکون سے حاصل کئے گئے تھے، ہوشیاری سے وضع کئے گئے تھے۔ اور بڑے شوق و ذوق سے جمع کئے گئے تھے ایک منٹ کے غصّے میں اس طرح غارت ہو گئے کہ دوبارہ اس نقصان کی تلافی کسی طرح نہ ہو سکتی تھی۔

جذبات کے ہیجان سے وہ کانپنے لگا اور اُس کا سانس پھول گیا، وہ گرتا پڑتا کھڑکی تک گیا اور جھٹکا دے کر اُسے کھولا۔ نیچے اب بھی لوگ جوق در جوق کھڑے اُس کے گھر کی طرف دیکھ رہے تھے گویا اس کے اندر اُن کی آخری اُمیدِ نجات موجود تھی۔ باوجودیکہ فاؤسٹ نے اُن سے صاف صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ اُن کی امداد کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔

"اے بے کس مقہور روحو! اے مجبور و مُبتلائے آلام باشندو! اپنے خُدا کو پُکارو! فریب! سب کچھ فریب! وہ تمہاری مدد بس اتنی ہی کر سکتا ہے جتنی کہ کمزور بوڑھا بیوقوف فاؤسٹ!"

وہ کھڑکی میں سے پلٹا اور کتابوں کے ایک ڈھیر سے اُلجھ کر گرتے گرتے سنبھلا اُس نے

اِن کتابوں کو ٹھکرا دیا۔

" ترقی کی راہ میں رُکاوٹیں! لوگوں کو پھانسنے کے لئے پھندے! تم نے میری رُوح چوس لی۔ میری زندگی جذب کرلی۔ اور اُس کے عوض مجھے الفاظ کا خلاء دیدیا۔ دفع دفان ہو۔ تم بھی اسی طرح جلوگی جس طرح میں جل رہا ہوں "

بڑی سی کھُلی ہوئی بھٹی میں آگ اب بھی چمک رہی تھی۔ فاؤسٹ نے کتابیں اُٹھا اُٹھا کر اس میں پھینکنی شروع کیں۔ ان کے بوجھ سے اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے مگر وہ پوری طاقت سے اُنہیں آگ میں جھونک رہا تھا۔ کچّے اور رنگے ہوئے چمڑے کی جلدیں، جعلی اور کپڑے کی جلدیں، چھوٹی بڑی منجھولی کتابیں، بڑی تقطیع کی ضخیم کتابیں، سب آگ میں اُچھال دی گئیں۔ پھر پوری قوت سے اُس تسمے کو کھینچنا شروع کیا جس سے دھونکنی چلتی تھی یہاں تک کہ بھٹّی خوفناکی سے بھڑکنے لگی اور دھاڑتے ہوئے شُعلے فاؤسٹ کے کسی زمانے کے عزیز سرمایۂ علمی کو نگلنے لگے۔

وہ کتابوں پر کتابیں آگ میں جھونکتا رہا اور اُسے ایسا معلوم ہوتا رہا کہ یہ اس کی ساری زندگی کی آرزوؤں، اُمیدوں اور خواہشوں کی چِتا دہک رہی ہے۔ آگ کی تپش سے اُس نے صفحات کو مُڑتے بل کھاتے دیکھا اور اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں کی بھُوکی زبانیں سب کچھ چاٹ گئیں۔ فاؤسٹ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بچّے تڑپ تڑپ کر چیخ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ خُدا کیلئے اپنا ہاتھ روکو۔

کتابوں کا ایک ڈھیر اُس کے ہاتھوں میں تھا کہ وہ ذرا ٹھٹکا۔ ہُوا یہ کہ بھٹی کے سب سے گرم حصے میں ایک جلد چٹخ کر آگے آ پڑی۔ یہ مقدس عبارتوں کی ایک کتاب تھی اور اس کی جلد پر ہاتھی دانت کی ایک صلیب لگی ہوئی تھی۔ جلد علیحدہ ہوگئی اور جلی خط میں لکھے ہوئے اوراق کو جب آگ پہونچی تو وہ کھُلنے لگے۔ ایک لمحہ کے لئے ایک ورق سیدھا کھڑا نظر آیا اور آگ کی لپیٹ میں سے فاؤسٹ نے یہ الفاظ پڑھے :۔

"میرے معبود، تو رحیم ہے اور مہربان ہے"

فاؤسٹ نے چیخکر کہا۔"یہ جھُوٹ ہے۔ ابدی جھُوٹ"

اور شکستہ خاطری کے جنون میں اُس کے ہاتھوں میں جو گٹھڑ تھا آگ میں جھُونک دیا اور اس کے بعد اور کتابیں پھینکتا رہا، یہاں تک کہ بھٹی میں جگہ نہ رہی۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور اپنی زندگی کے کارنامے کو آگ لگتے دیکھتا رہا۔ تپش بہت زیادہ تھی، اتنی ہی جتنی کہ اس وقت اس کے مزاج میں تھی۔ اور اتنی ہی تیز تھی جتنی کہ جذبات کی آگ اُس کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ بھٹی دھاڑ رہی تھی اور کتابیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ جلنے والی ہر کتاب کو وہ پہچان رہا تھا اور اُن خوشگوار راتوں کو یاد کر رہا تھا جو اُن کے مطالعہ میں صرف ہوئی تھیں، یہ کتابیں فلسفہ، الٰہیات، الکیمیا، اور عجائبِ فطرت کے علوم کی تھیں۔

ایک کتاب اور کتابوں سے زیادہ آگ سے بچ رہی تھی۔ اُس نے فاؤسٹ کی توجہ جذب کر لی۔ یہ ایک ایسی کتاب تھی جس کو فاؤسٹ نے کم سے کم تیس ۳۰ سال سے کھُول کر

نہیں دیکھا تھا۔ موجودہ اُفتادِ مزاج میں اس کتاب کے غیر متوقع طور پر نظر پڑ جانے سے فاؤسٹ کی اکثر بھُولی بسری باتیں اُبھر آئیں۔ اس کا موضوع تھا سحر اسود یا کالا جادو۔ اس کی جلد انسانی چمڑے کی تھی اور یہ اُس انسان کی چمڑی تھی جسے قتل کے جُرم میں پھانسی دی گئی تھی۔ سرورق پر ایک بڑا سا سیاہ دائرہ تھا۔

کتاب کھُلی اور صفحات اِس طرح علیحدہ ہو گئے جیسے نامعلوم ہاتھوں نے اُنہیں کھُول کر رکھ دیا ہو۔ اور فاؤسٹ کی نظریں اِن الفاظ پر جم گئیں جو اُنہیں نکلنے والے شعلوں کی طرح دہک رہے تھے :۔

"بدی کا مقابلہ بدی سے کر۔ اس کے لئے جہنمی رُوحوں کو تلاش کر۔"

پھر کتاب کا ایک اور صفحہ کھُلا اور یہ آتشیں الفاظ نظر آئے :۔

"علم ہی طاقت ہے، اور تجھے رُوحوں پر قابو دیا جائیگا......"

پھر ایک صفحہ اور اُلٹ کر سامنے آیا اور فاؤسٹ نے بڑھتی ہوئی گھبراہٹ میں پڑھا:۔

"اگر تُو چاہتا ہے کہ ارواحِ ظلمت پر قابو پائے تو چودھویں شب کو چوراہے پر جا۔"

"اور کیا ہے۔ اور کیا ہے؟" فاؤسٹ نے ہانپ کر کہا۔ اور جھپٹ کر آگ میں سے کتاب اُٹھانی چاہی مگر آگ کی تپش نے اُسے پیچھے ہٹا دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے عصا سے اُس کتاب کو بھٹی میں سے نکال لے، شعلوں نے اُسے پھُونک دیا اور اُس کی سیاہ راکھ بھی دُودکش میں آگ کے خرّاٹے کے ساتھ چڑھ گئی۔

فاؤسٹ لرزتا اور بیدم سا ہوکر اپنی کرسی میں گر گیا۔ اُسے یہ کتاب یاد آگئی تھی اور وہ اپنی دُھندلی یادداشت میں سے اُسکے منترا عمل کے طریقے کرُید کرُید کر نکالنے لگا۔

گھنٹوں وہ اسی طرح نیم جان و بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ آگ کے شعلے کم ہوتے گئے یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی زبانیں رہ گئیں جن سے عجیب عجیب بل کھائے ہوئے سائے دیواروں اور چھت پر پڑنے لگے۔

پھر ایک گہری آہ بھر کر فاؤسٹ اُٹھا اور اپنی جنتری دیکھی، اور آپ ہی آپ بولا:۔

"آج ہی چودھویں شب ہے۔ اچھا تو ایسا ہی ہوگا۔ میرے غریب بھائی بندوں کی مدد کے لئے اگر خُدا اپنا ہاتھ نہیں اُٹھاتا۔ اور چاہتا ہے کہ ہم اس عذاب میں سڑتے رہیں تو میں ابلیس سے طالبِ امداد ہونگا۔"

چھٹا باب

آدھی رات کا وقت تھا۔ شہر روڈوا سے کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر ایک اُجاڑ جنگل میں کوئی مدہم سی چیز کُہر اور پالے میں چلی آ رہی تھی۔

یہ فاؤسٹ تھا۔ بھاری سا لبادہ پہنے وہ اُسی وقت گھر سے چل پڑا تھا جب اُس نے تاریکی کی رُوحوں سے امداد حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اُس کا رُخ چوراہے کی طرف تھا جو کُہر میں صاف نظر نہ آ رہا تھا اور اُس سے کوئی دو سو گز آگے تھا۔

پورا چاند آسمان میں چمک رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے سے کُہر دھوئیں کی طرح بل کھاتی اُوپر کو اُٹھتی تھی اور چاند کے چہرے کو تاریک کر دیتی تھی۔ اس سے عجیب عجیب بل کھائے ہوئے سائے درختوں کے ٹھنڈوں اور ٹھٹھری ہوئی جھاڑیوں پر پڑتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن میں کوئی خبیث رُوح سما گئی ہے جس کی وجہ سے اُن کی شکل وہیئت ڈراؤنی معلوم ہوتی تھی۔

فاؤسٹ چوراہے پر پہونچا اور عین وہاں کھڑا ہو گیا جہاں سڑکیں کٹتی تھیں۔ یہاں وہ چند منٹ سیدھا کھڑا رہا، اُس کی ڈاڑھی اور لمبی لمبی لٹیں ہوا میں اُڑ رہی

تھیں اور ہوا کے جھونکوں سے اُس کا لبادہ پھڑپھڑا رہا تھا، اُس نے چاند اور ستاروں کو نظر جما کر دیکھا۔ پھر اپنا عصا اُٹھا کر بآوازِ بلند پکارا :۔

" فاؤسٹ ! جھجک کر پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو بہت بوڑھا آدمی ہے۔ تیری زندگی ختم ہو چکی۔ اگر تو اپنی غیر فانی رُوح بیچ کر بھی روڈا کے باشندوں کو آرام و سکون پہونچا سکتا ہے تو یہ کام تجھے کرنا پڑیگا۔ اِس آخری ایثار و قربانی سے تو اپنی بے سُود زندگی کا کفّارہ ادا کر سکتا ہے ۔۔"

ایک تیز جُنبش سے اُس کا ہاتھ اور عصا آگے کو پھیل گیا۔ اور اپنے گرد زمین پر ایک بڑا دائرہ بنایا۔ اس میں ایک اور چھوٹا دائرہ بنایا اور پھر ایک اور اُس کے اندر بنایا۔ پھر اپنی جھولی میں سے ایک کھوپڑی نکالی جو اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ چاند کی طرف مُنہ کر کے سینے کے قریب دونوں ہتھیلیوں پر کھوپڑی رکھکر اُس نے زور سے کہا :۔

" بدی کی رُوحو! میں تمہاری مدد چاہتا ہوں !"

پہلے اُس نے خیال کیا کہ اُس کی صدا بے اثر رہی۔ لیکن ایک منٹ کی خاموشی کے بعد کچھ تبدیلی ہوئی۔ ہوا تیز ہو گئی، پھر اور بھی زیادہ شدید ہو گئی اور زور شور کی آندھی چلنے لگی جس سے ٹھٹری ہوئی جھاڑیاں بجھ گئیں۔ چاند نے اپنی روشنی سلب کر لی جیسے کسی چراغ کی بتّی ایک دم سے اُتار دی گئی ہو۔ اور پھر جہاں دائرے بنائے گئے تھے زمین میں سے چھوٹے چھوٹے شُعلے نکلنے لگے۔ یہ شُعلے ایسے تھے کہ ہوا کے ساتھ بڑھتے تھے، یہاں تک کہ جب ہوا چیخنے چلّانے لگی تو یہ خاصے اُونچے اُونچے ہو گئے۔

ہوا کے تیز جھونکوں سے فاؤسٹ کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور ایک زور کا جھونکا جو گر پڑا مگر شعلوں نے اُسے اِس طرح سہارا دیا جیسے کوئی دیوار ہو۔ اُنکی خوفناک لمبی نیلی اور زرد زبانیں اُسے چاٹ چاٹ کر پیار کرنے لگیں لیکن جلایا نہیں۔

فاؤسٹ نے پھر چلاّ کر کہا "میفسٹو۔ بدی کی رُوح، ظاہر ہو!"

اِس خوفناک حکم پر فطرت کے جُملہ عناصر نے اتنا زور شور اور اتنی تُندی اختیار کی اور کوئی ہوتا تو سہم جاتا۔

حشرات الارض اپنے اپنے سُوراخوں سے نکل کر بھاگنے لگے۔ بیشُمار چوہے پُھدکتے ہوئے قریب سے نکل گئے، اور خوف سے چیختے ہوئے سڑک پر بھاگ گئے۔ چمگادڑیں اور رات کو اُڑنے والے پرندے فاؤسٹ کے سر پر پھڑپھڑانے لگے۔ اور خطرے کی آوازوں میں چیخنے لگے۔ ہوا کے جھونکے اور بھی تیز ہو کر طوفان بن گئے۔ زمین لرزنے اور ہلنے لگی اور شُعلے اور بھی زیادہ اُونچے ہوئے اور اُن میں سے کرخت آواز گانے کی آنے لگی گویا شیاطین مِل کر غیر انسانی موسیقی کے ساتھ ملعونوں کے گیت گا رہے تھے۔

ہوا کے فرّاٹے کے ساتھ بجلی کی گرج سُنائی دینے لگی۔ بجلی کے کوڑے ہر طرف سے اُن شُعلوں پر برسنے لگے جو فاؤسٹ کو گھیرے اور ڈھکے ہوئے تھے۔ اسپر شعلے اور بھی اُچھل اُچھل کر بلند ہوئے اور اُن کا جہنمی گیت زیادہ کرخت اور فتحمندی سے سُنائی دیا۔

اب اِس سارے شور و غُل پر ایک اور آواز چھا گئی۔ یہ تیز سرسراہٹ کی آواز تھی۔

دُور بہت دُور سیاہ آسمان کے پس منظر پر روشنی کا ایک نُقطہ نظر آیا اور اس میں سے یہ آواز آ رہی تھی۔ یہ نُقطہ بے انتہا تیزی سے قریب آ رہا تھا اور اس کے ساتھ جو آواز تھی وہ کانوں کے پار ہوئی جاتی تھی۔

فاؤسٹ نے آواز سُنی اور پلٹ کر اُسے اُچھلتے ہوئے شُعلوں میں سے دیکھا۔ وہ اس کی طرف برق رفتاری سے آ رہا تھا اور اس کے چاروں طرف ایک بھیانک روشنی نظر آ رہی تھی۔ فاؤسٹ کو کچھ مدّھم نظر آیا کہ تین خبیث گھوڑے ایک گاڑی کو آسمان میں اُڑائے لئے چلے آتے ہیں اور اس میں کوئی ایسی دہشتناک چیز بیٹھی ہے جس کے دو سینگ ہیں اور اُسے دیکھنے سے نفرت آتی ہے۔ شُعلوں کے دائروں سے کچھ فاصلے پر آ کر وہ چیز رُکی۔ آواز کا ایک چناخا اتنے زور کا ہوا کہ کان گنگ ہو گئے۔ جہاں سے یہ آواز آئی تھی وہاں سے ایک تیز سفید روشنی اُوپر کو اُٹھی اور آسمان سے جا ٹکرائی۔ وہ شُعلے جو فاؤسٹ کو گھیرے ہوئے تھے دیوانہ وار چکّر کھانے لگے۔ گویا ادب سے جُھک رہے تھے اور آگ کے گھیرے کے گھیرے ان شُعلوں سے اُٹھ اُٹھ کر تیزی سے فاؤسٹ کے اُوپر گردش کرنے لگے اور اُن کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ فاؤسٹ دائروں کے مرکز پر مُنہ کے بل گرا۔

اِس کے بعد چاروں طرف سنّاٹا چھا گیا۔

خاموشی کا ایک طویل عرصہ گذر گیا۔ فاؤسٹ کی طاقت اور ہمّت پھر عود کر آئی۔

اُس نے اپنا سر اُٹھایا اور چاروں طرف خائف نظروں سے دیکھا۔ اب سماں ایسا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا، گویا اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور اُس نے جو کچھ دیکھا تھا عالمِ خواب میں دیکھا تھا۔ آندھی اُتر چکی تھی اور اس کے سارے اثرات زائل ہو چکے تھے۔ بھڑکنے والے شعلے سب معدوم ہو گئے تھے۔ اب صرف اس کے ہاتھ میں عصا تھا اور تین دائرے تھے جو اُس نے اپنے گرد بطورِ حصار کھینچے تھے۔

یکایک ایک شکستہ آواز نے فاؤسٹ کو مخاطب کیا اور اس گہری خاموشی کو توڑا۔ یہ ایک عجیب بوڑھی آواز تھی:-

"تُو نے مجھے بُلایا تھا!"

فاؤسٹ ابھی اپنے گھٹنوں ہی کے بل کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا اور سامنے ایک بڑے سے پتھر کے کنارے پر ایک عجیب بُوڑھا آدمی ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا نظر آیا۔ اس کے کپڑے بوسیدہ تھے۔ سر پر ایک جھکی ہوئی ڈھیلی سی ٹوپی تھی جس میں سے لمبی لمبی سفید لٹیں نکلی ہوئی تھیں۔ اس ٹوپی کو اُس نے تعظیماً تھوڑا سا اُٹھایا اور پھر اپنے سر پر منڈھ لیا۔ وہ مسکراتا ہوا آہستہ آہستہ فاؤسٹ کی طرف بڑھا۔ اس مسکراہٹ میں مسرت کے ساتھ ساتھ چالاکی بھی تھی۔ چہرے سے خوشی ٹپکتی تھی لیکن یہ خوشی بدی کی تھی۔

فاؤسٹ اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہوا۔ اسے ابھی تک پوری طرح سکون حاصل نہ ہوا تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اس بڈھے کے پاس جائے۔ کیونکہ فاؤسٹ کو

یقین تھا کہ یہ شہزادۂ ظلمات کا یا تو کوئی غلام ہے یا ابلیس خود ہے۔ لیکن اُسی لمحہ نو وارد نے اپنا سر گھمایا اور اس کا چہرہ چاند کی طرف ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے جہنّم کے قعرِ آتشیں۔ مسرّت و شادمانی کے آثار اُس کے چہرے سے اس طرح معدوم ہو گئے جیسے کسی نے چہرے پر سے ایک پرت اُتار دیا ہو اور فاؤسٹ نے دیکھا کہ اُسکے سامنے ایک نفرت انگیز اور بھیانک چیز بیٹھی ہے۔

خوف کی ایک چیخ کے ساتھ فاؤسٹ کی ساری ہمّت رُخصت ہوئی اور اُسکے بوڑھے اعضا جس قدر تیزی سے اُسے لے جا سکتے تھے وہ بے تحاشہ شہر کی جانب بھاگا۔ جب کبھی وہ پلٹ کر دیکھتا تھا تو اُسے وہی بُڈھا پتھر پر بیٹھا نظر آتا تھا، اسی طرح ساکت و صامت۔ جب وہ اس شاہ بلوط کے پُرانے درخت کے قریب پہنچا جہاں سے روڈا کو سیدھا راستہ جاتا تھا تو فاؤسٹ نے اپنی رفتار بدل دی۔ اور لمبے لمبے قدموں سے چلنا شروع کیا۔ موڑ پر سے گذرنے کے بعد جب وہ درخت کے پاس آیا تو اُس نے دیکھا کہ اس کے تنے سے لگا کوئی کھڑا ہے۔ یہ ایک شخص تھا، عجیب چھوٹے سے قد کا بُڈھا۔ اور جب فاؤسٹ نے اُس کے چہرے پر بدی کی مُسکراہٹ دیکھی اور اُسے تعظیماً ٹوپی اُتارتے اور منڈھتے دیکھا تو اُس کے دل میں خوف کی ایک رَو دوڑ گئی۔

فاؤسٹ نے پھر اپنے قدم تیز کئے یہاں تک کہ وہ شہر کے بیرونجات میں پہونچ گیا اور دروازے میں سے گذرا۔ دروازے کی محرابوں کی تاریکی میں وہ کسی چیز سے

اُلجھ کر گرتے گرتے سنبھلا۔ اُس نے نیچے جُھک کر دیکھا کہ کیا چیز ہے جو اُس کے پیروں میں آ گئی۔ پھر ایک دم سے ڈر کر پیچھے اُچھل کر کھڑا ہو گیا کیونکہ اب پھر اس کے سامنے وہی عجیب چھوٹا سا بُڈھا تھا جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا اور تعظیماً ٹوپی اُتار کر سر پر منڈھ رہا تھا۔ چہرے پر وہی بدی کی مُسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی جہنمی چمک تھی۔

اُس مخلوق سے جسے اُس نے خود طلب کیا تھا۔ فاؤسٹ جلد از جلد دُور بھاگا۔ اور اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک اپنے گھر کے دروازے پر نہیں پہنچ لیا۔ یہاں پہنچکر اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ سانس پھُول گیا تھا۔ صبح کاذب کا وقت تھا۔ لوگ بیدار ہو چلے تھے۔ بعض لوگ اپنے مُردوں کو شہر سے دُور دفنانے لے جا رہے تھے۔ بعض اپنے بیماروں کے سلسلے میں تگ و دَو کر رہے تھے بعض جلدی جلدی بازاروں میں دبکے دبکے چلے جا رہے تھے۔

فاؤسٹ نے اپنے اُجڑے ہوئے کمرے کا دروازہ کھُولا پھر دروازے کا سہارا لیکر ساکت کھڑا ہو گیا۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ نہ آگے بڑھنے کو جی چاہتا تھا اور نہ پیچھے ہٹنے کو۔ سامنے جو نظر گئی تو دیکھا کہ میز کے پاس بیٹھے موڑے وہی پستہ قد بُڈھا بیٹھا اُنگلیاں چٹخا رہا ہے اور چھت کی طرف بے اعتنائی سے تک رہا ہے۔ اِس سے پہلے کہ فاؤسٹ اپنے لرزہ اور تشنج پر قابو پائے نو وارد نے آہستہ آہستہ اپنا سر پھیرا۔ اور فاؤسٹ کی طرف تعجب سے دیکھا، گویا فاؤسٹ کی موجودگی کا

علم اُسے نہیں تھا۔ پھر ایک دم سے وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ تعظیماً جھکا اور اپنی پچکی ہوئی ٹوپی اُتار کر پھر سر پر منڈھ لی۔

"تُو نے مجھے بلایا تھا۔ تیرا حکم ماننے کیلئے میں یہاں حاضر ہوں"۔

فاؤسٹ جھجکتا ٹھٹکتا بدقت تمام آگے بڑھا گویا اس خوف انگیز مخلوق کے قریب جانے سے اجتناب کر رہا تھا۔ مگر بڑی ہمت کر کے وہ اُس کے پاس گیا اور غور سے اُسے دیکھنے لگا۔ پھر اُس سے پوچھا:۔

"تُو کون ہے؟ میں نے تجھے نہیں بلایا۔ تو میرے کمرے میں کیوں آیا ہے؟"

فاؤسٹ ڈر رہا تھا کہ دیکھئے کیا جواب ملتا ہے۔ نو وارد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ پھرتی سے اُس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا اور تمسخر آمیز مسکراہٹ سے فاؤسٹ کو دیکھنے لگا۔ اپنے بوسیدہ چغے کے اندر ہاتھ جلدی سے ڈال کر اُس نے رنگی ہوئی جھلی کا ایک مٹھا نکالا اور اُسے فاؤسٹ کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ اُسکا طرزِ عمل تکریمانہ تھا مگر اس وقت اس کی مسکراہٹ تضحیک آمیز اور فاتحانہ تھی۔

فاؤسٹ خاموش کھڑا اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

نو وارد نے ایک اور سریع جنبش کے ساتھ اُس مٹھے کو کھول کر فاؤسٹ کی نظروں کے سامنے کر دیا۔ یہ کسی قسم کی دستاویز تھی، جیسے کسی وکیل نے معاہدے کا مسودہ تیار کیا ہو۔ نو وارد نے ذرا پرے ہٹ کر اُس پر اپنی انگلیاں پھیریں اور ایک دم سے اس میں شعلے بھڑکنے لگے اور جیسے جیسے یہ معاہدہ جل کر سیاہ ہوتا گیا

اس کے حروف بل کھانے اور انگاروں کی طرح دہکنے لگے۔

فاؤسٹ نے اُنہیں پڑھنا شروع کیا:۔

"اس معاہدے کی رُو سے میں فاؤسٹ معلّم اپنے عقیدۂ خُدا پرستی سے دست کش ہوتا ہوں" اور اپنی رُوح ابلیس کی حفاظت میں دیتا ہوں۔ ابلیس جو دُنیا کا مالک ہے۔ اور اس کے عوض میں ارواحِ ظلمات اور ساری خبیث رُوحیں دُنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک میری نہیں فاؤسٹ کی تابع فرمان ہوں گی۔"

نووارد نے تیزی سے اِس معاہدے کو پھر لپیٹ لیا اور یہ بالکل ویسا ہی صحیح و سالم تھا گویا جلا ہی نہ تھا۔ نووارد نے اب غور سے فاؤسٹ کو دیکھنا شروع کیا۔

فاؤسٹ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "دفع ہو یہاں سے شیطان۔"

"تُو نے مجھے بلایا تھا۔ میں یہاں سے نہیں جا سکتا جب تک کہ تُو اس معاہدے پر دستخط کر کے مجھے آزاد نہ کر دے۔"

"جا، جا، یہاں سے دفع ہو۔" یہ کہہ کر فاؤسٹ لڑکھڑاتا ہوا کھڑکی کے قریب گیا اور اُس کے واسے پر اپنی کہنیاں ٹکا کر دونوں ہاتھوں سے سر کو مضبوطی سے پکڑا۔

"موت، ہر طرف موت، وبا اور موت!" فاؤسٹ نے کھڑکی میں سے نیچے

دیکھ کر کہا۔ سڑک پر ایک ٹھیلہ مُردوں سے لدا ہوا گزر رہا تھا۔ ان پر ایک ٹاٹ کا ٹکڑا ڈھکا ہوا تھا۔ کلیسا کے خُدّام اپنا عجیب لباس سر پہنے اس ٹھیلے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی انگیٹھیاں لٹکی ہوئی تھیں جن میں گندھک، جڑی بوٹیاں، لوبان اور اسی قسم کی دُھونیاں سُلگ رہی تھیں۔

فاؤسٹ نے اپنے دل میں کہا "اگر مجھے صرف ایک دن کے لئے اتنی قدرت حاصل ہو جاتی!"

"کیا تیری یہ آرزو ہے؟ تجھے ایک دن کے لئے یہ قدرت حاصل ہو سکتی ہے"

فاؤسٹ نے پلٹ کر اُس کی طرف تعجب سے دیکھا، اسکے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ بڑی مُشکل سے وہ بولا "اور کیا اِس کے معاوضہ میں مجھے اپنی رُوح نذر کرنی پڑیگی؟"

"نہیں! یہ دن تیرا ہی ہوگا۔ جس طرح چاہے اُسے صرف کر۔ دیکھو!" یہ کہہ کر نووارد نے فاؤسٹ کی ریت گھڑی اُٹھائی اور اُلٹ کر رکھدی۔

"چوبیس گھنٹے کے لئے۔ لیکن پہلے تجھے معاہدے پر دستخط کرنے پڑینگے۔ اگر اِس گھڑی کی ریت ختم ہو جانے سے پہلے تو اپنے کئے پر پچھتائے اور یہ سودا تیری سمجھ میں نہ آئے گا تو...... اس معاہدے کو تُو فسخ کر سکتا ہے"

فاؤسٹ چونک کر آگے بڑھا اور بہت اشتیاق سے پوچھنے لگا:-

"بیماروں کو بچانے کی قدرت کیا مجھکو حاصل ہو جائے گی؟"
"تُو مالک ہوگا جو حکم تو دیگا وہ پورا ہوگا۔"
"تو مجھے منظور ہے۔ لاؤ معاہدے کی دستاویز مجھے دو۔ میں دستخط کرتا ہوں۔"
نووارد کے چہرے پر فتحمندی کے آثار نمایاں ہوئے۔ اُس کی آنکھیں جہنّم کے دو ...کی طرح دہکنے لگیں۔ اس نے دستاویز کو کھول معلّم کے آگے پھیلا دیا۔
فاؤسٹ نے اُسے لیکر قلم کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن نووارد نے قلم اُس کے ہاتھ اٹ لیا اور اس کے بدلے اپنے چغے میں سے ایک سُرخ رنگ کا پَر نکالا۔
"فاؤسٹ تیری اپنی روشنائی اس معاہدے کے لئے کچھ کام نہیں دے سکتی۔ اس کے لئے دوسری ہی چیز درکار ہے۔"
یہ کہہ کر نووارد نے فاؤسٹ کی دوات فرش پر اُلٹ دی۔
فاؤسٹ نے اس کی طرف مُستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔
"صرف وہ چیز خون کا ایک قطرہ ہے، فاؤسٹ۔"
اُس نے ایک لمحہ کے لئے فاؤسٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہایت نرمی سے لیا اور پھر زور سے کلائی کی رگ میں پَر کی نوک بھونکدی اور دبا کر خون کا ایک قطرہ نکالا۔ زندگی کی یہ روشنائی اُس نے اپنی زبان قلم کو چٹائی اور قلم فاؤسٹ کے ہاتھ میں دیدیا۔
ایک لمحے کے لئے فاؤسٹ نے پس و پیش کیا پھر معاہدے پر اپنے دستخط ثبت کر دئے۔

"صرف ایک دن کیلئے ہے نا؟ چوبیس گھنٹے ختم ہونے سے پہلے میں اگر چاہوں تو اِسے واپس لے سکونگا؟ جس وقت چاہوں اُسی وقت۔ کیوں اے خبیث رُوح یہی بات ہے نا؟"

نووارد نے جلدی سے اُس معاہدے کو جھپٹ کر اپنے چُغے کی جیب میں جو سینے پر تھی رکھا۔ اُس کی آنکھیں پھر دہکنے لگیں اور اُس کے چہرے پر بدی چھا گئی۔

"صرف ایک دن کے لئے......" فاؤسٹ نے معاہدے کو دُہرایا۔

"ہاں...... جبتک اسکی ریت ختم ہو"

ساتواں باب

شیطان غائب ہو چکا تھا اور فاؤسٹ اپنی کلائی پر خون کے قطرے کو دیکھ رہا تھا اور اُس معاہدے کے الفاظ پر غور کر رہا تھا جس پر اُسنے دستخط کئے تھے۔

"ہاں! میں نے اپنا نام اور اپنا خون دیا ہے مگر رُوح نہیں دی ہے۔ چوبیس گھنٹے! بہت کچھ کرنا ہے۔"

دروازے پر زور سے کھٹ کھٹ ہوئی اور بہت سی آوازوں نے باہر سے فاؤسٹ کو بُلایا۔ یہ آوازیں التجا اور غم سے بھری ہوئی تھیں جنہیں سُنکر فاؤسٹ کا دل بھر آیا۔ وہ کمرے میں سے گزر کر کھڑکی کے پاس گیا، اُسے کھولا اور نیچے جھانک کر دیکھا۔

جب فاؤسٹ جھانکا تو نیچے سے لوگوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"فاؤسٹ۔ ہم تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ ہماری مدد کر۔"

"مصیبت زدہ لوگو۔ ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر فاؤسٹ نے دروازے کی چٹخنی پر ہاتھ رکھا مگر ذرا سی دیر کے لئے کسی

فکر میں پڑ گیا۔

"میں اِس طرح لوگوں کو بچاؤں گا...... ابلیس کا نام لیکر!"

اور دروازہ کھول کر وہ مجمع کے سامنے آیا جو اُس کے دروازے تک سیڑھیاں طے کر کے پہونچ گیا تھا۔ اور ایک عورت دوڑکر آگے آئی اور فاؤسٹ کی ٹانگوں سے لپٹ کر پُرالتجا نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"فاؤسٹ! فاؤسٹ! میرا شوہر! بہت نیک آدمی۔ دُنیا بھر میں سب سے نیک آدمی۔ وہ مر رہا ہے۔ تُو مقدّس بزرگ ہے اُسے اچھا کردے فاؤسٹ!"

"اُسے میرے پاس لاؤ!" فاؤسٹ نے کہا۔

دو جوان آدمی اُسے ڈولی میں ڈالکر سیڑھیوں پر لائے اور اُسے فاؤسٹ کے قدموں میں لِٹا دیا۔ فاؤسٹ اُس پر جُھکا۔ اپنا ہاتھ اُسکے دل پر رکھا اور اپنے دل میں کہا:۔

"ابلیس کے حُکم سے اُٹھ!"

اثر حیرت انگیز تھا۔ وہ شخص سیدھا اُٹھ بیٹھا اور اپنے چاروں طرف تعجب سے دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بڑی گہری نیند سو رہا تھا اور کسی نے ایک دم سے زور سے گھنٹی بجادی۔ دیکھنے والے سکتے کے عالم میں رہ گئے اور پھر تعجب سے چیخنے لگے۔ وفورِ مسرّت سے سب کے سب ملکر چیخے۔ "مُعجزہ! معجزہ!"

ایک جوان عورت نے فاؤسٹ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور بڑی منت سماجت سے بولی:۔

"اے فاؤسٹ۔ خُدا کے نیک بندے۔ میری ماں! اُسے بھی اچھا کر دے۔ اُسے بچا دے اور جب تک میں جیتی رہونگی روزانہ تیرے لئے مسیح سے دعا مانگا کرونگی"۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنی بیمار ماں کی طرف اشارہ کیا جو ایک چٹائی پر سیڑھیوں کے قریب پڑی تھی۔

فاؤسٹ اُتر کر اُس کے قریب گیا۔ لوگ تعظیم سے اُس کے لئے راستہ چھوڑتے گئے اور جب وہ قریب سے گزرتا تو اُس کے چُغے کا دامن چومتے تھے۔ وہ اس کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا۔ مگر بےچین تھا۔ کیونکہ اُسے ایک دم سے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی مخالف قوت اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ فاؤسٹ نے مریضہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور خوف نے اُسے گھیر لیا۔ کیونکہ اُس کے سامنے وہ علامت تھی جو اسکی کوششوں کو رد کر رہی تھی۔ اُس کے سینے پر مقدس صلیب رکھی تھی۔

فاؤسٹ نے اپنا سارا زور صرف کر دیا کہ اُس کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھدے۔ لیکن نظر نہ آنیوالے ہاتھوں نے اُسے ہٹا ہٹا دیا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور بولا:-

"میں تجھے واسطہ دیتا ہوں......"

لیکن وہ نام تو کیا اُس کی ہوا تک لبوں پر نہ آسکی۔ اس نے چاہا کہ رد کرنے والی طاقت کے مقابلے میں زبردستی اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھدے۔ لیکن اُس کی کلائی میں ایسا درد ہوا کہ وہ تلملا گیا۔ جیسے کسی نے دہکتی تلوار کا وار کیا ہو، اور اس کا ہاتھ بیکار ہو کر لٹک گیا۔ اُس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا اور اُس کی

پیشانی پر پسینہ کے موٹے موٹے قطرے نمودار ہو گئے۔ تنفّس تیز ہو گیا اور ذہنی انتشار کی وجہ سے وہ لرزہ براندام تھا۔ اپنی مخالف قوت ــــ صلیب ــــ سے مقابلہ کرنے کے لئے وہ پھر جُھکا اور اپنے دشمن کو زیر کرنے کی اُس نے ایک کوشش اور کی جس طرح اپنی جان بچانے کے لئے کوئی تیراک موجوں سے لڑتا ہو۔ اسی طرح فاؤسٹ بھی صلیب کی طرف سے نظریں پھیرے عورت کے سینے کے قریب ہونے کی کوشش کرتا رہا۔

لیکن لڑکی نے، جواب دم توڑتی عورت کے سر کو سہارا دئیے ہوئے تھی، فاؤسٹ کی پریشانی کو دیکھ کر صلیب کو مُنہ کے سامنے کر دیا، اور رو رو کر کہنے لگی "فاؤسٹ! اسے بچا۔ مسیح کے صدقے میں!"

فاؤسٹ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا جیسے کسی نے زور سے اُس کے مُنہ پر گھونسہ مارا ہو، اُس کا سانس گھُٹ رہا تھا۔ سر پیچھے کو پڑا ہوا، ہاتھ آگے کو پھیلے ہوئے گویا کسی نامعلوم زبردست دشمن سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

خوف کی ایک سرگوشی چاروں طرف سُنائی دی:۔

"وہ مقدّس صلیب کا سامنا نہیں کر سکتا!"

فاؤسٹ اپنی سیڑھیوں پر گرتا پڑتا چڑھا۔ وہ اُس زبردست قوت سے خائف ہو کر بھاگ رہا تھا جس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی اور جس نے اُسے پسپا کر دیا تھا۔

غصّے کا شور بلند ہونے لگا۔ ایک شخص نے چیخکر کہا:۔
"وہ معجزہ دکھاتا ہے مگر شیطان اُس کی مدد کرتا ہی۔ سنگسار کرو اسے"
ہر طرف سے آواز اُٹھی۔ "ہاں اسے سنگسار کرو۔ شیطان کے خادم کو سنگسار کرو"
پتھر کی ایک کتّل ہوا میں سے بھنّاتی ہوئی آئی اور فاؤسٹ کے سر پر سے گزر کر دروازے میں زور سے لگی۔ اِس کے بعد ہی پتھروں کی ایک بوچھاڑ آئی جیسے چڑیوں کا جھلّڑ ہو۔ ان میں سے کچھ تو دروازے میں لگے۔ کچھ دیوار میں اور کچھ فاؤسٹ کے بھی لگے۔ فاؤسٹ کے ڈھیلے ڈھالے چُغے نے اُسے ان پتھروں کی ضرب سے بڑی حد تک محفوظ رکھا مگر ایک کتّل اُس کی پیشانی پر لگی۔ اور لگی بھی اتنے زور سے کہ اُس کا سر چکرا گیا اور خون بہہ کر اُسکی آنکھوں میں آگیا۔
فاؤسٹ پلٹ کر بھاگا۔ دروازہ جلد سے جلد کھول کر اندر سے بند کرلیا اور چٹخنی چڑھادی۔ پتھروں کی بوچھاڑ دروازے پر پڑ رہی تھی اور غیظ و غضب کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈگمگاتے قدموں سے وہ اپنے معمل میں داخل ہوا شکستِ تمنّا و آرزوِ نارسیدہ سے اُس کا دل ڈوب رہا تھا۔ مرنے والی عورت کے جسم پر جس نامعلوم قوت سے اُسے سابقہ پڑا تھا اُس کے خیال سے وہ لرز رہا تھا۔
تو یہ تھا نتیجہ اس سارے ایثار کا! اور اس کے لئے اس نے اپنی غیر فانی رُوح کو خطرے میں ڈالا تھا۔
پتھر اب اُسکے معمل کی کھڑکی پر برس رہے تھے، یہاں تک کہ ان میں ایک شیشہ

بھی سلامت نہیں رہا۔

اُس نے اپنی زندگی کے آخری سال کا جُوا کھیلا تھا اور اپنی آیندہ زندگی کو بھی داؤں پر لگا دیا تھا۔ اِس اُمید میں کہ روڈا کو وبا سے نجات دلا سکے گا۔ اور وہ ہار گیا تھا، اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ جو معاہدہ اُس نے کیا تھا اُسے رہن کے ختم ہو جانے سے پہلے فسخ کر دینے کا اُسے اختیار حاصل ہے۔

اُس نے تکلیف و غم سے چیخ کر کہا "میرے لئے زندگی اب کیا حقیقت رکھتی ہے؛ مجھے زندہ رہنے کی تمنّا نہیں۔ میری آرزوئیں ختم ہوئیں۔ میرا عقیدہ فنا ہو چکا۔ علم کو میں نے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ اب ایسے فرائض بھی نہیں ہیں جنہیں میں انجام دوں۔ ایثار و قربانی بھی بے اثر و بے سُود ہے۔ زندگی تو ایک عذاب ہے"۔

ایک دم سے اُسے خیال آیا کہ اگر وہ اسی عرصہ میں مرجائے تو شیطان سے جو معاہدہ اُس نے کیا ہے وہ از خود فسخ ہو جائیگا۔

اپنے دل میں اُس نے کہا "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوگا"۔

اُس نے ایک بڑی سی الماری کھولی اور ایک سیاہ رنگ کی بوتل اس میں سے نکالی۔ اس پر مُردے کی کھوپڑی بنی ہوئی تھی جس کے اُوپر قوس کی شکل میں یہ الفاظ لکھے تھے "پیو اور بھول جاؤ"۔ اس میں سے تھوڑا سا عرق شیشے کے ایک پیالہ میں نکالا۔ یہ عرق بے رنگ تھا اور اس میں ہلکی خوشگوار خوشبو تھی۔ پیالے کو دونوں ہاتھوں میں لیکر فاؤسٹ نے اپنے لبوں تک اُٹھایا اور بولا:-

"مجھے نجات دلا۔ اے جامِ موت!"

جیسے ہی پیالے سے اُس کے لب چھُوئے ایک سایہ سا تیرتا ہوا دیوار میں سے نکلا۔ اور اُس نے شکل اختیار کرنی شروع کی۔ ایک ہاتھ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ اور شیطان اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

"نہیں۔ تُو اس طرح مجھ سے بچ نہیں سکتا۔ ریت ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے مایوس انسان کے کپکپاتے ہاتھوں سے پیالہ لے لیا۔

فاؤسٹ نے پوچھا۔ "تو کیا انسان اپنی موت کے لئے کوئی وقت پسند نہیں کر سکتا؟"

شیطان نے پیالہ ایک دفعہ پھر اُٹھایا اور کہا۔ "اِس کے اندر دیکھ۔"

فاؤسٹ نے پیالے کے اندر دیکھا اور اُس میں اُسے وہی بے رنگ زہر نظر آیا۔ مگر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گدلا ہو گیا اور دودھیا ہو کر اس میں طرح طرح کے چمکدار رنگ نظر آنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس میں جان پڑ گئی ہے۔ ایک ہی لمحہ بعد گدلا پن چھٹ گیا اور اس کے پیشِ نظر ایک عجیب و غریب منظر تھا۔ یہ منظر ایک خواب تھا جوانی اور زندگی کا۔ ایک چہرہ اس میں سے اُسے دیکھ کر مُسکرا رہا تھا، یہ کسی نوجوان کا چہرہ تھا جو شباب کی گرمجوشی اور رُوح کی ترنگ کی کہانی سُنا رہا تھا۔ زندگی کے لُطف اور اپنی قوّتوں پر اعتماد کی غمّازی کر رہا تھا۔

جوانی نے فاؤسٹ کے دل پر ہمیشہ اثر کیا تھا مگر شباب کی ایسی شاندار

تصویر اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ چھلکتی ہوئی جوانی، تڑپا دینے والا شباب۔
اُس نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ کیا ہے جو میں اس موت کے پیالے میں دیکھتا ہوں؟"
"موت نہیں، فاؤسٹ، بلکہ زندگی، جو تجھے جوانی کے حسین تصوّر سے موہ رہی ہے"۔
شیطان نے اُس کے کان میں کہا۔
"تُو کون ہے جو زندگی کا ذکر کر رہا ہے؟"
"تُو کیا سمجھ رہا ہے کہ میں کون ہوں؟ میری بہت سی شکلیں ہیں، لیکن تُو مجھے خوب جانتا ہے اے فاؤسٹ میں میفسٹو ہوں"۔
"تُو مجھے یہ حسین خواب دکھا کر میرا ہاتھ کیوں روکتا ہے؟ مجھے آئندہ زندہ رہنے کی تمنّا نہیں ہے"۔
"بے بس فاؤسٹ۔ تُو موت کی آرزو کیوں کرتا ہے۔ تُو جس نے کہ ابھی زندہ رہنا بھی شروع نہیں کیا"۔
"مجھے زندگی سے نفرت ہے۔ بے کس مُعلّم نے درد و اذیت سے چیخکر کہا۔
"پیالے میں پھر دیکھ"! میفسٹو نے کان میں کہا۔
فاؤسٹ نے دیکھا۔ جوانی کی تصویر مٹ چکی تھی۔ بُلبُلے تیزی سے اُٹھ رہے تھے اور عرق اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا جوش جاتا رہا۔ روشنی کے نقطے اور تاریکی کے دھبّے اس کی سطح پر متحرّک نظر آئے۔ اِن سب سے آہستہ آہستہ ایک تصویر بنی خوفناک بھیانک، اس کے سامنے چند ٹوٹی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں۔ ایک کھوپری تھی جس

میں کیڑے کلبلا رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کھوپری کے جو مدہم خد و خال نظر آ رہے تھے وہ خود فاؤسٹ ہی کے تھے۔

میفسٹو نے سانپ کے پھنکارے کی طرح پوچھا "کیوں فاؤسٹ۔ تو کیا تو موت ہی کو پسند کرتا ہے؟"

فاؤسٹ نے پیالے کو زمین پر دے مارا اور اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کر کرب و صعوبت سے چیخنے لگا:۔

"میں نے زندگی کو بہت دیکھا ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔"

"نہیں فاؤسٹ" میفسٹو نے کہا "تو نے صرف کتابوں کو دیکھا ہے۔ عیش نہیں دیکھا۔ عیش ہی صرف زندگی ہے"

"میرے لئے عیش کس کام کا۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ وقت نے میری کمر دوہری کر دی۔ عیش کی اب میری عمر کہاں"

"میں تجھے جوانی دونگا۔ سب تحفوں سے بڑا تحفہ۔ دیکھ! اسے لے جوانی" یہ کہکر میفسٹو نے اُس زہر کی طرف اشارہ کیا جسے فاؤسٹ نے فرش پر پھینکدیا تھا اور جو بہہ کر بجا ہو گیا تھا۔

اُس کی سطح پر اُس نے پھر ایک نوجوان کی صورت دیکھی، چونکا دینے والا شباب۔ بیخوف چمکدار آنکھیں اور غرور سے سر تنا ہوا۔

میفسٹو نے اپنے ہاتھوں کے گھیرے میں فاؤسٹ کے شانوں کو لیکر کہا:۔

"تُو نے اپنی صورت کو دیکھا۔ اگر تُو صرف اِس خیال کو دلنشین کرے تو تُو ایسا ہی ہو جائے گا فاؤسٹ"

فاؤسٹ کے مُنہ سے ایک لمبی چیخ نکلی جس میں اُمید و تکلیف، آرزو، مایوسی اور خواہش کچھ عجیب طرح سے ملی ہوئی تھیں۔

وہ میفسٹو کی طرف پلٹا۔ اس کے ہاتھ التجا میں پھیلے ہوئے تھے۔ چہرہ زرد اور رحم طلب تھا۔

جذبات سے گُھٹی ہوئی آواز میں اُس نے کہا۔ "مجھے جوانی دیدے"

ذہنی کشمکش سے بیدم ہو کر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور شیطان کے چہرے کو نہیں دیکھا کہ اس پر کیا بات پیدا ہوئی، حالانکہ اس کا چہرہ فاؤسٹ سے اتنا ہی قریب تھا جتنے کہ خود اُس کے الفاظ۔

آنکھیں بھڑک رہی تھیں اور چہرے پر بے رحمی چھائی ہوئی تھی اُس نے اپنے دل میں کہا۔ آخر کو میرے دام میں آ ہی گیا۔

آٹھواں باب

اب سورج خوب چڑھ چکا تھا اور ریت گھڑی کی ریت سے معلوم ہوتا تھا کہ معاہدہ پر دستخط کئے ہوئے کم از کم تین گھنٹے ہو گئے ہونگے۔

سورج کی ایک کرن کمرے کے وسط میں بلوط کی ایک میز پر پڑی اور فاؤسٹ کو منوّر کر دیا۔ جو اس میز پر مُردے کی طرح چت پڑا تھا۔ ہاتھ سینے پر تھے اور آنکھیں بند تھیں۔

میفسٹو اُسے کھڑا دیکھ رہا تھا۔

"میرا میرا اب یہ میرا ہے۔ اور میں نے نور کی قوتوں سے بازی جیت لی۔"

اُس نے غرور سے اپنا سر بلند کیا اور بولا:۔

"شیطان کی طاقت کا مقابلہ کون کرسکتا ہے!"

بھٹی دھاڑ رہی تھی اور آگ خوفناک سے بھڑک رہی تھی۔ جلتے ہوئے سفید کوئلوں پر میفسٹو اچھل کر جا کھڑا ہوا اور شعلوں کے قریب اپنا مُنہ کر کے زور زور سے پھونکنے لگا۔ شعلے چیخ چیخ کر اُچھلنے لگے یہاں تک کہ اُنھوں نے میفسٹو کو ڈھک لیا۔

شعلے ناچتے اور اپنا جہنمی نغمہ الاپتے رہے۔ ان کے بیچ میں سے میفسٹو نے زور لگا کر کسی چیز کو باہر کھینچا اور آگ میں سے نکل کر کمرے کے بیچ میں اُسے کھینچ لایا۔ یہ کسی چیز کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا جو لہراتا بل کھاتا اُس کے پیچھے پیچھے اُڑ رہا تھا۔ اس پر رنگ برنگے شعلوں کی زبانیں دوڑ رہی تھیں اور بھڑک رہی تھیں۔

اس سے اُس نے فاؤسٹ کو ڈھک دیا۔ اس طرح کہ اس کے کونے نیچے لٹکے رہے۔ پھر اُس نے اپنے لبادے میں سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکالا اور اپنی ہتیلی پر رکھ لیا۔ پھر فاؤسٹ کے چہرے پر سے آتشیں چادر ہٹالی۔ فاؤسٹ کا بوڑھا سفید ڈاڑھی والا چہرہ تھکا ہوا اور غم و اندوہ کی تصویر معلوم ہوتا تھا۔ اس آئینہ کو اُس کے قریب ایک لمحہ کے لئے رکھا اور پھر چادر اُڑھا دی، اس طرح کہ فاؤسٹ اس آتشیں چادر میں بالکل چھپ گیا۔ میفسٹو نے آئینہ میں غور سے دیکھا اور بدی سے ہنسا کیونکہ اس آئینہ میں فاؤسٹ کا چہرہ مُقید تھا۔ یہ چہرہ تذبذب اور پریشانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اُس کے لب التجا میں کپکپاتے نظر آتے تھے! اس آئینے کو میفسٹو نے اپنے لبادے میں سینے کے قریب رکھ لیا گویا یہ ایک جوہر تھا، نہایت بیش قیمت۔

اُس نے اپنے ہاتھ تین دفعہ اٹھائے اور نیچے گئے اور بڑی تیزی سے میز کے گرد چکر کاٹا۔ جب وہ چلتا تھا تو شعلے بھڑک کر اونچے ہو جاتے تھے یہاں تک کہ ساری میز ایک آگ کی دیوار میں محصور نظر آتی تھی جس میں سے آگ کی شاخیں

نکل کر کمرے کے ہر کونے میں بل کھاتی اور مچلتی تھیں۔ محل اب ایک بہت بڑی بھٹی بن گئی تھی جس میں کوئی چیز جلتی نہیں تھی۔ شعلوں کے شیطانی شور میں جہنمی گیت کی تیز آواز سنائی دے رہی تھی۔ آتشیں چادر اُبھر رہی تھی اور دب رہی تھی گویا اُسکے نیچے کوئی زبردست کشمکش ہو رہی تھی۔

"خاموش رہو، روحو! ساکن رہو!" میفسٹو نے حکم دیا۔ "بس اتنا کافی ہے!"

اور اُسی وقت بالکل سکون ہو گیا گویا کچھ تھا ہی نہیں۔

شعلے غائب ہو گئے۔ گانے کی آواز معدوم ہو گئی۔ چادر کا رنگ مٹیالا ہو گیا تھا اور اب اس میں کوئی جنبش نہ تھی۔ اس پر سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے نیچے ایک بےحس و حرکت جسم پڑا ہے۔

میفسٹو نے بڑی پھرتی سے ایک ہی جھٹکے میں چادر کھینچ لی۔ اور حکم دیا:۔

"اُٹھ، اُٹھ اور اپنی زندگی گذار!"

بوڑھا فاؤسٹ غائب ہو گیا تھا۔ اسکی بجائے ایک بےمثل حسین نوجوان لیٹا تھا جس کا لباس سفید اور سنہرے ریشم کا تھا۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اُچھل کر فرش پر کھڑا ہو گیا اور وفورِ مسرت سے انگڑائی لینے لگا گویا بڑی لمبی نیند سے جاگا تھا۔ وہ نہایت متناسب الاعضا، خوبصورت گاؤدم ٹانگیں، پتلی کمر، مضبوط اور ملائم گردن جس پر خوشنما بڑا سر اس انداز سے دکھائی دیتا تھا کہ گویا غرور و پندار اس میں سمایا

ہوا ہے۔ سر پہ سیاہ بالوں کے بیچ در پیچ کاکل تھے وضع قطع ایسی تھی کہ قوت و نزاکت اس میں سموئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لباس اطالوی طرز کا تھا۔ پیروں میں سفید چست جامہ، زیر قبا اور کمر کا پٹکا سنہرا تھا، جوتا، چغہ اور ٹوپی سب مل کر سونے کا ڈلا معلوم ہوتا تھا۔ ٹوپی میں ایک سیاہ پر لگا تھا۔

اُس کے چہرے پر راستبازی و معصومیت جھلکتی تھی۔ تلخ تجربوں کی جھریاں اس پر نہیں تھیں۔ مصائب دُنیا کے خطوط سے چہرہ پاک تھا اور زندگی کی روشنی سے منوّر تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں سے حوصلہ مندی اور بےخوفی ٹپکتی تھی۔ اس کی شخصیت سے خود اعتمادی، قوت و فراست مُترشح ہوتی تھی۔

میفسٹو اس کے پیچھے کھڑا اپنے کارنامے کو طمانیت سے دیکھ رہا تھا۔ یکایک ایک سایہ بھٹی میں سے نکلا اور اُس کے قریب آیا۔ یہ سایہ میفسٹو کے لاتعداد مظاہر میں سے ایک تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ شکل اختیار کرنی شروع کی اور میفسٹو کا وجود تحلیل ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک نیا میفسٹو متشکّل ہو گیا۔ اس نئے میفسٹو نے فاؤسٹ کو غور سے دیکھا اور بغیر پلٹے ہوئے اپنے پہلے دُھندلے وجود کو اشارہ کیا جو متحرک ہو کر غائب ہو گیا۔

میفسٹو نے اب ایسی شکل اختیار کر لی تھی جیسی کہ دُنیا دار انسانوں کی ہوتی ہے۔ وضع قطع ایسی تھی کہ فاؤسٹ کے لئے اس کی نئی زندگی میں نہایت مناسبت رکھتی تھی۔

جوانی میں چُور، وہ طاقتور اور قدآور جوان تھا شخصیت ایسی تھی کہ جو اسے دیکھے عزّت و احترام کرے۔ لباس انتہائی فیشن ایبل تھا۔ یہ چمکدار سیاہ ریشم کا تھا جس میں کہیں کہیں سُرخ رنگ کی جھلک نظر آتی تھی چُست پیجامہ، جوتے، سینہ بند پٹکا اور ٹوپی، سب کا رنگ سیاہ تھا۔ کندھوں سے بیرون تک ایک لمبا ڈھیلا ڈھالا سیاہ چمکدار چُغہ تھا۔ اس کا حاشیہ سُرخ رنگ کا تھا اور وہ متحرک ہوتا تھا تو عجیب و غریب روشنیاں اس میں سے نکل کر دوڑتی نظر آتی تھیں۔ ٹوپی سر پر خوب جمی ہوئی تھی اور اس میں پیچھے کو نکلا ہوا ایک غیر معمولی لمبا سا سُرخ رنگ کا پَر لگا تھا۔ جب میفسٹو تعظیماً جھکتا تھا تو یہ پَر سیدھا کھڑا ہو جاتا تھا اور ہواہیں کوئی گز بھر لہراتا نظر آتا تھا۔ یہ پَر گویا بُرائی کا ایک سُرخ پھول تھا جو بدی کی سیاہ جڑ سے اُگا تھا۔ پہلو میں ایک مُرصّع دستے کی قرولی تھی جو چُغہ میں چھپی رہتی تھی۔

آگے آکر میفسٹو نے فاؤسٹ کے سامنے تعظیماً سر جُھکایا اور بولا "میفسٹو آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔"

لیکن اس کی آنکھیں جو فاؤسٹ کی نظروں سے پوشیدہ تھیں تمسخر و تضحیک سے چھلک رہی تھیں۔

فاؤسٹ تن کر سیدھا کھڑا ہوا اور مُسکرا کر میفسٹو سے بولا "کیا تم میرا حُکم مانو گے اور تمہارے ساتھ دُنیا کی اور سب رُوحیں بھی میری تابع ہیں، پورے ایک دن کے لئے؟"

میفسٹو نے ریت گھڑی پر ہاتھ رکھکر جواب دیا۔"جب تک کہ اس ریت کا آخری ذرّہ نہ گر جائے۔ بتا تو مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟"

"کام کا انتخاب کرنا بہت دشوار ہے۔ میری بہت سی آرزوئیں ہیں۔ اِس لمحے تک میں مُردہ تھا میں نے تو اب زندگی شروع کی ہے۔ میری ساری زندگی ضائع ہوئی۔ میرے پاس وافر علم ہے مگر مجھے اس کی مطلق ضرورت نہیں۔ اب میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے زندگی دے۔ میں اُس سب کچھ کا آرزومند ہوں جو دُنیا دے سکتی ہے۔"

"خائف نہ ہو۔ میں ساری خواہشوں میں تیری خدمت کروں گا۔ دیکھ!"

میفسٹو نے جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ بھٹی کی طرف اُٹھایا جس میں سے کہر کی طرح دُھندلی سی ایک شکل آہستہ آہستہ برآمد ہو رہی تھی۔ یہ شکل رفتہ رفتہ جامد ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ فاؤسٹ کے سامنے ایک ایسی عُریاں دوشیزہ کھڑی نظر آئی جسے دیکھنے سے نظر خیرہ ہوتی تھی۔ دودھ جیسی سفید رنگت اور چمکدار سُرخ بال تھے۔ اس میں جان تھی کیونکہ اس کی رگوں میں خون دوڑ رہا تھا اور اس کے تنفس کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ حسین و معصوم تھا مگر اُسکے پھیلے ہوئے ہاتھ اور آنکھوں میں جو جذبہ جھلک رہا تھا اُس سے آرزوئے ہم آغوشی ٹپک رہی تھی۔

میفسٹو کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی اُس نے فاؤسٹ کے چہرے کو

بغور دیکھا اور اُس کے چہرے پر بہیمانہ اطمینان چھا گیا اور آپ ہی آپ بولا "پھر فتح ہوئی۔ فرزیں کی کیسی چال نکلی ہے۔ بساط پر ایسی کوئی اور چال نہیں چلی گئی۔ اب بازی میرے ہاتھ ہے۔ تیرے ساتھ میں نے کتنی اور رُوحوں کو اپنے جال میں پھانس لیا! اسپ بوڑھوں کے لئے رُخ عورتوں کے لئے اور فرزیں جوانوں کے لئے۔"

فاؤسٹ حسین دوشیزہ کی طرف بڑھا لیکن پیچھے سے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا گیا۔ اور وہ ٹھہر گیا۔ میفسٹو اُسکے پیچھے کھڑا تھا۔ آنکھیں خوفناک اور حقارت آمیز تھیں۔ اُسکے ایک اشارے پر وہ حسین شکل غائب ہو گئی۔ فاؤسٹ مسکراتا ہوا پلٹا اور بولا:-

"آہ! میفسٹو! فریب نظر! مجھے یہ حکم دینا پڑے گا کہ ایسی اور شکلیں تو مجھے نہ دکھائے۔ دُنیا کی صرف وہی چیزیں مجھے دکھا جن کا حقیقی وجود ہو۔ زندگی کی چیزیں۔"

میفسٹو نے طنز سے جواب دیا۔ "فریبِ نظر کیا ہوتا ہے اور حقیقت کسے کہتے ہیں؟ انسان کہاں ختم ہوتا ہے اور خواب کہاں شروع ہوتا ہے؟"

"مجھے التباس اور فلسفہ کی ضرورت نہیں ہے میفسٹو۔ انکا تعلق پُرانے فاؤسٹ سے تھا۔ آج تو میں حقیقی دُنیا کو دیکھنا چاہتا ہوں — وسیع خارجی دُنیا۔"

اس کا جواب میفسٹو نے اس طرح دیا کہ بڑی پھرتی سے اپنا چغہ کھول کر پھیلا

دیا اور بڑی خوشنمائی سے احتراماً جھک کر فاؤسٹ سے کہا"آپ نے حکم دیا ہے۔ آیئے میرے چغہ پر کھڑے ہو جایئے"۔

فاؤسٹ نے استعجاب سے اس کی طرف دیکھا اور اُسکے چغے پر جا کھڑا ہوا میفسٹو بھی اس کے برابر میں کھڑا ہو گیا اور فاؤسٹ کی کمر میں اپنا ہاتھ مضبوطی سے ڈال کر بولا:۔

"میں آپ کو ساری دُنیا دکھاؤنگا"۔

فاؤسٹ نے پُر اشتیاق نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور بولا:۔

"مجھے صرف دُنیا کا عیش دکھا"۔

"جیسی آپ کی مرضی ہو۔ آیئے"۔

اُس نے فاؤسٹ کی کمر مضبوطی سے پکڑ لی اور نظر جما کر اور پیشانی پر بل ڈالکر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پوری کی پوری کھڑکی دیوار میں سے علیحدہ ہو کر باہر کے رُخ نیچے سڑک پر جا پڑی۔ اُنکے پیروں تلے چغہ لرزا اور پھر زمین سے اُونچا ہو گیا گویا اس پر کوئی بوجھ ہی نہیں تھا۔ تھوڑی سی دیر تک میز کے اوپر مُعلق رہا اور ساکت ہو گیا گویا عقل رکھتا ہے اور مُنتظر ہے کہ اُس کے مالک ذرا جھک جائیں تو آگے بڑھے۔ پھر جھکولا کھا کر اُس نے گویا چلنے کا ارادہ کیا اور تیزی سے کھڑکی میں سے نکل کر ہوا میں تیرنے لگا۔

جب وہ باہر نکل آئے تو وہ اُونچے ہوتے گئے اور جب گرجا کے قریب سے

گزرے تو میفسٹو نے اپنا مُنہ پھیر لیا اور تیزی سے چکّر کاٹ کر آگے بڑھ گئے اور تھوڑی ہی دیر میں روڈا سے کئی میل نکل گئے۔

ہوا اِن سے ٹکرا ٹکرا کر چیخ رہی تھی مگر فاؤسٹ نے دیکھا کہ تیز ہوا کے فراٹوں سے نہ تو اُس کا سانس گھُٹ رہا تھا اور نہ آنکھیں جھپک رہی تھیں۔ پیروں تلے جو چُغہ تھا پتلا تھا لیکن جامد محسوس ہو رہا تھا اس پر سے جُھک کر وہ اپنے نیچے سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ منظر بڑی تیزی سے اُس کی نظروں کے سامنے بدل رہا تھا۔

میفسٹو نے پوچھا۔ "کونسا مُلک دیکھنا چاہتا ہی؟"

"پہلے مجھے دیکھ لینے دے۔ پھر بتاؤنگا۔"

بغیر کسی حُکم کے چُغہ نے اپنا رُخ بدل دیا اور جنوب مشرق کی سمت میں روانہ ہوا۔ کئی علاقوں پر سے اسی طرح وہ گزرتے رہے۔ دریا، پہاڑ، کاہستان، تالاب اور جنگل بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اِنہیں فاؤسٹ دیکھ رہا تھا اور اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ پیڈوا کی جامعہ کے زاویۂ علمی میں بیٹھا دُنیا کی بڑی سی گیند گھومتی دیکھ رہا ہی۔

میفسٹو نے کہا۔ "اگر کسی مُلک کو قریب سے دیکھنا چاہو تو کہہ دینا۔ چُغہ وہیں ٹھہر جائیگا اور اگر وہاں اُترنا چاہو گے تو اُتر سکو گے۔"

کوہستان الپہ کی اُونچی برف پوش چوٹیوں پر سے وہ گذرے اور فاؤسٹ نے اپنے نیچے جھیلیں دیکھیں جو نیلم کی طرح چمک رہی تھیں۔ جب بحرِ روم پر سے گذرے فاؤسٹ کے کہنے کے مطابق وہ ذرا نیچے اُتر آئے اور چُغے کی رفتار بھی بہت کم ہو گئی۔

نیچے بادبانی جہاز تیر رہے تھے۔

میفسٹو نے کہا۔"ہسپانیہ کے عظیم الشان جہازوں کی ابتدا یہی سے ہوگی اور ان کی تباہی بھی دُور نہیں ہے"

سمندر پر سے وہ گزر گئے۔ کوہِ اطلس کے سلسلے کو عبور کرکے ریت کے وسیع صحرا پر اُڑنے لگے۔ گرم سورج کی دھوپ میں یہ صحرا سلگ رہا تھا اور اس کی ریت کی چمک سے نظر خیرہ ہوتی تھی۔ اس کے بعد جنگل اور گھنے بنوں پر سے ہوتے ہوئے ساحل پر آئے جہاں ذرا سا توقف کیا۔

میفسٹو نے بتایا "یہ ملک حبش ہے جہاں کے باشندوں کی قسمتیں عنقریب اُن سفید چمڑی والوں کی قسمتوں سے مِل جائیں گی جو سمندر پار نو یافتہ ملکوں میں رہتے ہیں۔ سفید قوموں نے میری خدمت بہت کی ہے۔ اور قوموں کے مقابلے میں میرے احکام ماننے کیلئے یہ لوگ بہت آمادہ رہتے ہیں"

فاؤسٹ نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے کہا" وہ ملک جو حال ہی معلوم ہوئے ہیں! ہاں میں نے اُن کا ذکر سنا ہے میں اُنہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے وہاں لے چلو میفسٹو"

اب وہ پھر جادو کی سی تیز رفتاری سے روانہ ہوئے۔ سمندر پر سے گزرے، سورج کو دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا، ہوا کے جھکڑوں اور طوفانوں میں سے گذر گئے۔ فطرت کے خوفناک مظاہر سے مامون و مصئون رہے۔ علاوہ اُس وقت کے جب

بادل آجاتے تھے فاؤسٹ سب کچھ دیکھتا جارہا تھا۔ سمندر کا لامتناہی سینہ کبھی اُبھرتا کبھی
رنگ بدل رہا تھا۔ ابھی پُرسکون و خاموش۔ ابھی مُنتشر و پُرخروش،
با۔ پانی کے اُونچے اُونچے فوّارے چھوٹتے تھے اور پہاڑ جیسی
ہیں۔ بڑی بڑی وھیل مچھلیاں پانی میں کھیل رہی تھیں اور اُن کے
پانی کی اُونچی اُونچی دھاریں نکل رہی تھیں۔ مگر فاؤسٹ کے
لئے یہ سمندر ایک اُجاڑ منظر پیش کر رہا تھا کیونکہ اس پر نہ تو کوئی جہاز تھا اور
نہ انسان۔

میفسٹو نے اس کے خیالات معلوم کر لئے۔ جبھی تو اُس نے کہا کہ "فاؤسٹ! ایک دن ایسا آئے گا کہ اس سمندر کی سطح پر نشاناتِ راہ قائم کئے جائیں گے۔ بڑے بڑے راستے بنیں گے اور چھوٹے راستے نکالے جائیں گے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح تمہاری بستی میں سڑکیں ہیں! بڑے بڑے جہاز جن کا سان گمان بھی تمہیں نہیں ہوسکتا اس طرح آئیں جائیں گے جس طرح ہوا میں پرندے اُڑتے ہیں۔ کئی جہاز پُرانی دُنیا سے راستہ بھٹک کر سمندر سے لڑتے بھڑتے اِن نئی دُنیاؤں میں پہونچے مگر صرف ایک ہی یہاں سے واپس جا سکا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ باقیوں کا کیا حشر ہوا سوائے میرے۔" اور جب یہ کہہ کر اُس نے کنکھیوں سے فاؤسٹ کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر تمسخر کے آثار تھے۔

جب دوبارہ زمین پر نظر ڈالی تو فاؤسٹ کو ایسا معلوم ہوا کہ کافی طویل عرصہ

ہو گیا۔ پھر اُسے کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے اس طرح پھیلے ہوئے نظر آئے جیسے ستارے بکھرے پڑے ہوں۔ اُس کے بعد ہی وہ نئے برّاعظم پر اُڑ رہے تھے۔ یہ مُلک گرم اور شاداب تھا۔ اس میں بڑے بڑے جنگل کھڑے جھُوم رہے تھے اور سرسبز کاہستانوں سے لدا مُسکراتا نظر آتا تھا۔

میفسٹو نے اسے دیکھکر کہا۔ "اِس مُلک کو دریافت کئے ہوئے مشکل سے سفید قوموں کو ایک پُشت گذری ہوگی۔ مگر اس تھوڑے ہی سے عرصہ میں اُنھوں نے میرے نام کو کافی فروغ دیا ہے۔ کیونکہ میں حاکم ہوں، اِس دُنیا کا حاکم ہوں۔" یہ کہکر اُسنے حقارت سے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر احتراماً فاؤسٹ کے آگے اپنا سر ذرا سا جُھکا کر بولا۔ "اب کدھر؟ کیا تم نے اپنے عشرت کدہ کے لئے کسی مقام کو منتخب کر لیا؟ کیا ان مُلکوں میں چلوگے جہاں ابدی برف کا تسلّط ہے؟ یا اُن پوشیدہ مقامات کو چلنا چاہتے ہو جہاں آج تک انسان نے قدم نہیں رکھا؟ یا تم چاہتے ہو کہ میں اپنے جِنّے کو حکم دوں کہ مشرق میں ہمیں لے چلے چین ماچین یا کسی اور مُلک کو جس کا ذکر تم نے پڑھا ہو یا سُنا ہو اور اپنی آنکھوں سے اُسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو؟"

"نہیں، میفسٹو! مجھے تنہائی کی جستجو نہیں ہے اور نہ میں اسے پسند کرتا ہوں کہ ایسے اجنبی لوگوں میں پھروں جو عجیب عجیب زبانیں بولتے ہیں۔ گھڑیاں تیزی سے گزر رہی ہیں۔ میرا وقت بہت کم ہے مجھے میرے ہمجنسوں میں لے چلو۔ نہیں۔ ٹھہرو! مجھے اپنی پسند سوچنے دو۔ مجھے اٹالیہ لے چلو۔ جہاں میں نے اپنی طالب علمی کا زمانہ

گزارا تھا، اور یہی وہ زمانہ ہے جسے میں یاد کرتا ہوں تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔"

میفسٹو نے کہا۔ "اچھا تو پھر اطالیہ چلو۔"

چُغے نے چکر کاٹا اور پھر فراٹے بھرنے لگا۔ برق رفتاری سے ہوا چیخ رہی تھی۔ سمندر پر سے اس تیزی سے گزرے کہ فاؤسٹ کو صرف ایک مسلسل چمک نظر آ رہی تھی اور بس۔

رفتار کچھ دھیمی ہوئی اور جب خشکی قریب آتی دکھائی دی تو فاؤسٹ کی بے صبری کچھ کم ہوئی۔

جب اس پر سے گزرے تو میفسٹو نے کہا۔ "یہ انگلستان ہے۔ ذرا سا جزیرہ ہے مگر ایک دن ساری دُنیا پر حکومت کرے گا اور بہت عرصہ تک حکومت کریگا۔"

اب وہ آہستہ آہستہ اُڑ رہے تھے اور فاؤسٹ شہر گانوؤں اور قریوں کو پہچانتا جا رہا تھا۔ فرانس پر سے وہ پھر تیز ہو گئے۔ جرمنی اور اپنے محبوب سیکسنی پر سے ہوتے ہوئے کوہستان الپیہ کو عبور کیا اور پھر سوئٹزرلینڈ میں آ گئے اور اُسکے بعد وہ اطالیہ کی فضا میں اُڑ رہے تھے۔

دن ختم ہو رہا تھا اور ایک شاندار شہر میں انہیں روشنی کے نقطے نقطے سے نظر آ رہے تھے۔

ان کے گرد ہوا کا جو شور تھا ملتوی ہو گیا۔ چُغہ کی رفتار ختم ہو گئی اور وہ ٹھہر گیا۔ ہلکی گرم ہوا کے جھونکے آنے لگے اور اُن سے چُغہ پھڑپھڑانے لگا۔

فاؤسٹ نے چُغہ پر سے جُھک کر دیکھا اور میفسٹو نے تمسخر آمیز نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ ایک دم سے آتشبازی کا سیلاب سا اُٹھا۔ سونے کے فوارے چھوٹنے لگے، چمکدار رنگوں کے ستارے، نارنجی شُعلے اور سانپ کی طرح بل کھاتی شکلیں نظر آئیں۔
فاؤسٹ نے کہا "معلوم ہوتا ہو کہ کوئی بڑی خوشی منائی جا رہی ہے اس کے ذرا قریب چلیں تاکہ اچھی طرح دیکھیں۔"
چُغہ تیزی سے نیچے اُترا مگر ایک تخت کی طرح ہموار رہا۔ یہاں تک کہ نیچے بھیڑ میں اُسے لوگ چلتے پھرتے اور ناچتے نظر آنے لگے۔ جس جگہ آتشبازی چھوٹ رہی تھی وہاں فاؤسٹ کی نظر جم کر رہ گئی۔ ناچ خوب رونق پر تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفوں سے موسیقی اور سب کے مِل کر گانے کی مدّھم آواز بھی آ رہی تھی۔
میفسٹو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور اُن میں وہ ریت گھڑی تھی جو فاؤسٹ کے معمل میں رکھی رہتی تھی۔ آدھی سے زیادہ ریت گِر چکی تھی۔ بدی سے ہنس کر اُس نے ریت گھڑی ہوا میں اُچھال دی اور وہ غائب ہو گئی۔
نیچے جو منظر پیشِ نظر تھا فاؤسٹ اُس میں منہمک تھا۔ سامنے ایک عالیشان محل تھا جس کے احاطے میں یہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔
اُس نے میفسٹو کی طرف مُڑ کر دیکھا اور پوچھا "یہ خوش عیشیاں کس تقریب میں منائی جا رہی ہیں؟"

شیطان نے جھک کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا "پرما کی نواب بیگم کی آج شادی ہوئی ہے جو اطالیہ کی حسین ترین اور سب سے زیادہ مغرور عورت ہی"

فاؤسٹ نے چونک کر کہا "پرما کی نواب بیگم! بھلا کوئی ایسا بھی ہے جس نے اُس کا ذکر نہ سُنا ہو! وہ تو سارے یورپ میں اپنے حُسن کی شہرت رکھتی ہے۔ میں اس حسین ہیلن کو دیکھونگا"

میفسٹو اور قریب ہو گیا اور فاؤسٹ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر اپنا مُنہ فاؤسٹ کے کان سے لگا کر آہستہ اور صاف بولا:۔

"یہ تیری ہوگی ـــــ آج رات کو"

نواں باب

رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا لیکن اس باہر کی تاریکی نے محل کے روشن منظر کو اور بھی اُجاگر کر دیا، بالکل اُسی طرح جس طرح سیاہ مخمل کے پس منظر پر درخشاں اوپل لرزتا نظر آتا ہے۔

صحن چبوترے پر نازک نازک یونانی ستون نصب تھے جن پر سُبک محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ اِن میں جو رنگے ہوئے پردے لٹکے ہوئے تھے اِس وقت سمیٹ کر ایک طرف کر دئے گئے تھے کیونکہ رات گرم تھی اور ہوا بند تھی۔ خوشیاں منانیوالے نیلے آسمان کے نیچے ناچ رہے تھے۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے اور نیچے نُقرئی شمعدانوں میں اُونچی اُونچی شمعیں اپنی سُرخ اور زرد زبانیں بلند کئے کھڑی تھیں۔ بُرنز کے بڑے بڑے رومی چراغ محرابوں میں چاندی کی پتلی پتلی زنجیروں میں لٹکے ہوئے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور بل کھا رہے تھے اور اُن کے معطّر تیل کے جلنے سے خوشبوئیں فضا میں پھیل رہی تھیں۔

محل کے ایک دُور کے کونے میں خوشبودار پانی کے فوّارے چھوٹ رہے تھے۔

یہ پانی چار کیوپڈ کے برنزی مجسموں کے منہ سے نکل رہا تھا۔ دکھایا یہ گیا تھا کہ یہ چاروں ناچ رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں۔ چاروں دھاریں ٹکرا کر پانی کا ایک مہین شامیانہ سا بناتی تھیں، جیسے ایک بڑا سا بلوریں جام اوندھا دیا گیا ہو۔ نیچے سے اس پر سنہری روشنی پڑتی تھی۔ جب پانی کا شامیانہ اتر کر نیچے گلابی مرمر کے حوض میں آتا تھا تو دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں پکھراج اس میں دمک رہے ہیں اور ان کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں۔

صحن کے سامنے کے رخ فوارے کے بالمقابل ایک اونچا وسیع برآمدہ تھا۔ اس پر پہنچنے کیلئے دو ڈھلواں چوڑے چوڑے زینے سنگِ مرمر کے تھے جن میں سبز رنگ کی دھاریاں اور رگیں تھیں۔

شہ نشین کے بیچوں بیچ میں ایک چبوترہ تھا۔ اس کے اوپر قیمتی ریشم کا شامیانہ تنا تھا اتنے کا رخ کھلا ہوا تھا۔ ہر طرف پیچ در پیچ قیمتی زرکار پردے آویزاں تھے۔ اس چبوترے کے ریشمی گدیلوں پر پرما کی نواب بیگم کہنی ٹکائے کروٹ سے لیٹی ہوئی تھی۔

شادی کی رسم ادا ہو کر ابھی تین گھنٹے ہوئے تھے اور اس کا شوہر اس کی طرف منہ اٹھائے اور ٹکٹکی لگائے اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ آنکھوں سے عشق و آرزو ٹپک رہی تھی۔ یہ شخص فلورنس کا رہنے والا تھا۔ خوبصورت اور وجیہہ نوجوان تھا۔ گیہواں رنگ، مغلوب الجذبات، سر اور مونچھوں کے بال

سیاہ رنگ کے تھے جو آنکھوں کی سیاہ پتلیوں سے خاص مناسبت رکھتے تھے۔ غالباً اُس کی شہزوری اور شجاعت، جنگجوئی اور تلوار بازی کی شہرت ہی نے نواب بیگم کے دل کو موہ لیا تھا۔ کیونکہ اس عورت کے حُسن کا شہرہ سارے اطالیہ میں تھا اور یورپ کے ہر حصے سے عُشاق آئے اور ناکام و نامراد پھرے۔

اُس نے اپنے شوہر کی طرف خواب آلود نظروں سے دیکھا اور اُس کے سر پر جو اس کی گود میں رکھا تھا محبت سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کا رنگ بھی گیہواں تھا مگر اسکے حُسن میں کچھ عجیب جادو تھا۔ اس میں کشش تھی مگر شاہانہ اجتناب کے ساتھ۔ سر کے بال سیاہ اور لمبے تھے اور جب وہ متحرک ہوتی تھی تو ان میں عجیب قسم کی نیلی روشنی دوڑتی نظر آتی تھی۔ چہرہ گول تھا۔ رنگت زیتون کی سی مگر اس میں سُرخی جھلکتی رہتی تھی۔ لیکن دراصل اس کی آنکھیں ہی تھیں جو دیکھنے والوں کے دلوں کو بَرماتی تھیں کیونکہ ان آنکھوں میں راز بھرے تھے اور وہ رُوح جو اُن میں سے جھانکتی تھی بیک وقت بےچین بھی تھی اور مُنظم بھی۔ جذبات سے لبریز بھی تھی اور خائف بھی۔ مجمع میں کوئی مرد ایسا نہیں تھا جسے اس فلورنسی کی خوش نصیبی پر رشک نہ آ رہا ہو، اور کوئی عورت ایسی نہ تھی جو نواب بیگم کے بے مثل حُسن اور عشوہ و غمزہ پر حسد نہ کر رہی ہو۔

لیکن اس کی مغرور و متلوّن رُوح بالآخر جُھک کر رہی۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ وہ محبّت کے جال میں پھنسی۔ وہ جو کتنی ہی دفعہ مردوں کے جذبات سے کھیل کر اپنا

دل بہلاتی تھی۔ چپکے چپکے اپنے پھندے پھیلایا کرتی تھی اور اپنے شکاروں کو اُن میں از خود پھنستا دیکھتی تھی، اُن کی کشمکش کو کسی تجربہ کرنے والے کی نظر سے دیکھا کرتی تھی اور پھر نفرت سے اُن کی طرف سے مُنہ پھیر لیا کرتی تھی تاکہ کسی اور دلچسپ صید کو پھانسے۔ وہ بھی آخر کار خود شکار ہو کر رہی۔

اُس نے اپنے شوہر پر جُھک کر آہستہ سے کہا۔ "پیارے! تم رقص کرنے والوں کی طرف نہیں دیکھتے۔ میں نے ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا کہ تم نے کسی ایسے منظر کو دیکھا ہو جسے میں نے اپنے آقا کو خوش کرنے کے لئے آراستہ کیا ہے۔"

اُس نے ہاتھ کو احتراماً بوسہ دے کر کہا۔ "آنکھیں دل کی پیروی کر رہی ہیں۔ تم نے میرا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لے لیا۔ اسے اسی طرح خوش رکھو جس طرح میں تمہارے دل کو خوش رکھونگا۔"

نواب بیگم نے اظہارِ محبّت کے ساتھ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔ اور یہ وعدہ خلوصِ قلب سے کیا گیا تھا۔ مگر کس قدر جلد توڑ دینے کے لئے!

صحن کا منظر اب اس قدر شاندار ہو گیا تھا کہ اُسے دیکھنے سے نظر خیرہ ہوتی تھی۔ یونان کا قدیم ناچ شروع ہو گیا تھا۔ پچاس لڑکیاں قدیم یونان کا ڈھیلا لباس پہنے ہوئے کاٹ کاٹ کر طرح طرح کی خوشنما شکلیں بنا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں طاؤس تھے جن کی سنگت میں یہ گا رہی تھیں اور ناچ رہی تھیں چاروں طرف اُونچی اُونچی دیواروں پر زرکار پردے آویزاں تھے اور ان دیواروں پر

گدے اور قالین بچھے ہوئے تھے جن پر مہمان بیٹھے تھے۔ سب کی نظریں اس عالی نواز منظر پر جمی ہوئی تھیں۔

یکایک اس میں بے ترتیبی سی ہوئی۔ فوارے کے پاس جو بڑا طلائی دروازہ تھا زور سے کھلا اور اس کی جھنجھناہٹ سے سب کی نظریں اُدھر اُٹھ گئیں۔ دروازے کے باہر عجیب عجیب آوازیں سنائی دیں۔ ایک سنہرے بالوں والا خادم لڑکا صحن میں سے دوڑتا ہوا آیا اور سبز مرمر کے زینے پر سے اُچھلتا ہوا نواب بیگم کے پاس شہ نشین پر پہونچا۔ سامنے جا کر دوزانو ہوا اور سر جھکا دیا:۔

"کیا ہے؟" بیگم نے تمکنت سے پوچھا۔

"اجنبی! نووارد! ناخواندہ مہمان! مشرق کے باشندے!" لڑکے نے ہانپ کر کہا۔ بھاگنے سے اُس کا سانس پھول گیا تھا اور باہر جو کچھ اُس نے دیکھا تھا اُس سے متحیر تھا۔

بیگم سنبھلکر اُٹھ بیٹھی اور سرد مہری و تمکنت سے بولی: "دروازہ کس نے کھولا؟ جو مہمان مدعو کئے گئے تھے سب آچکے۔ اگر وہ ناخواندہ ہیں تو اُنہیں مجھ سے اجازت لینی چاہیئے تھی۔ جا چھوکرے! جب تک مجھے معلوم نہ ہو جائے کہ وہ کون ہیں اُنہیں اندر آنے سے رُکوا دے۔"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات ختم کرے دروازے کے محافظ ایک طرف دھکیل دئے گئے اور اب ایک عظیم الشان منظر دکھائی دیا۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ

صحن کی روشنیاں، چراغ اور شمعیں سب مدھم پڑ چکی تھیں۔ اُن کے شُعلے مُرجھا کر نیلی زبانیں بن گئے تھے، کیونکہ نو وارد اپنی روشنیاں ساتھ لائے تھے۔ ان کے ساتھ جو لاؤ لشکر تھا اُس میں ایسی تیز روشنی کی شمعیں تھیں کہ یہاں کی روشنیاں اُن کے آگے ماند پڑ گئیں۔ ہر شمع کا شُعلہ بلند اور سفید روشنی کا تھا اور اُس کی چمک دمک کے آگے کسی کی آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ یہ ہجوم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رات کی سیاہ ہتھیلی میں کوئی روشن ہیرا پڑا دمک رہا ہے۔

یہ جلوس آہستہ آہستہ دروازے میں سے گذرنا شروع ہوا اور مہمان اور ناچنے والے حیران ہو ہو کر پیچھے ہٹنے لگے۔ وہ نواب بیگم کے شاندار مظاہر دیکھنے کے عادی تھے۔ لیکن جب اُنہوں نے اِسے دیکھا تو اوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیونکہ آج تک یہ تُزک و احتشام اُنھوں نے دیکھا ہی نہ تھا۔ یہ ایک خواب تھا نور و حُسن کا جو مشرق کی سمت سے نظر آیا۔

دو بڑے بڑے پُرشکوہ مکھنا ہاتھی دروازے کے باہر کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اُن کے لمبے لمبے دانت سُرخ رنگے ہوئے تھے۔ اُنکے سِروں پر سونے کے مُنقش تاج چڑھے ہوئے تھے۔ اِن دانتوں کے درمیان اُن کی سونڈیں ہل رہی تھیں اور وہ رہ رہ کر چنگھاڑتے تھے۔ ان ہاتھیوں پر زرکار ریشمی جھُولیں پڑی تھیں جن کی بستکوں پر فلس ماہی کی وضع کا سونے کا ماہی پُشت تھا۔ اس میں سے چاندی کی گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں جو چلنے میں بجتی تھیں۔ یہ ہاتھی جھُومتے ہوئے آگے بڑھے آتے تھے۔

ان عظیم الجثہ حیوانوں کے پہلو بہ پہلو حبشیوں کی قطاریں تھیں۔ ان حبشیوں کے ہاتھ سینے پر صلیبی شکل میں رکھے تھے اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔ ہر قطار کے آگے ایک جانباز تھا جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ یہ تلوار لمبی اور چوڑی تھی اور تیز سفید روشنی میں اس طرح چمکتی تھی کہ اسے دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ بدن پر مشرقی وضع کی زرہ اور خود تھی۔ سر سے پاؤں تک اپنے سردار کی قوت و سطوت کی تصویر بنا ہوا تھا۔

مگر سب کی توجہ کا مرکز دو ہاتھیوں کے درمیان آویزاں تھا۔ جب یہ ہاتھی صحن میں آگئے تو ان کے درمیان ایک جھولا نظر آیا جس میں مشرق کے ریشم و مخمل کے گدیلے لگے ہوئے تھے اور چھتری سونے کے پترے کی تھی جس میں رنگ برنگے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

اس جھولے میں ایک نوجوان بیٹھا تھا جس کا حسن اس دنیا کی چیز نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لباس نہایت بیش قیمت تھا جیسا کہ مشرق کے شہزادوں کا ہوتا ہے مگر اس کا رنگ اور ناک نقشہ یورپ والوں کا تھا۔ اس کا انداز نشست شاہانہ تھا۔ سر پُر وقار اور اونچا تھا اور طبیعت میں اجتناب کی کیفیت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں سے ایک روشنی نکل رہی ہے جو اس کے چاروں طرف لرز رہی ہے۔ اس سے اس کے تزک و احتشام میں اور بھی اضافہ ہوتا تھا۔

یہ جلوس روشنیوں میں چمکتا دمکتا آہستہ آہستہ صحن میں سے گزر کر شہ نشین

کے قریب پہونچ گیا اور مرمریں زینوں کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ اب ہاتھیوں نے اپنی سونڈیں سیدھی کر دیں اور پُر زور کرخت آواز میں چنگھاڑے گویا اس طرح سلامی دی۔

بیگم اس مداخلت کو دیکھ کر غصّے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی مگر اب اس کا غصّہ کچھ تو خوف اور کچھ تحیّر سے بدل گیا تھا۔ اُس کا شوہر ہاتھ پکڑے اُس کے برابر کھڑا تھا لیکن وہ بھی اس سحر آفریں منظر میں گُم ہو گیا تھا۔ پُر اسرار نو وارد۔ اُس کا بیش قیمت لباس۔ شاندار وضع قطع اور اُس کا پُرشکوہ سازو سامان۔ ان سب کے دیکھنے میں وہ کھو گیا تھا۔ مُلازم اور محافظ جو شہ نشین کے گرد متعیّن تھے آگے بڑھ کر ان مداخلت کرنے والوں کو روکنے لگے مگر انہیں گرفتار کرکے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے۔

دو حبشی دوڑ کر آگے بڑھے۔ ایک اِس زینے سے چڑھا اور دوسرا اُس سے، اور جو تُحفے تحائف لائے تھے بیگم کے قدموں میں ڈال دیئے۔ ایک حبشی، قالین اور غالیچے، شال اور چادریں لئے ہوئے تھا۔ ان پر سونے چاندی کا عجیب و غریب کام بنا ہوا تھا اور اس قدر خوبصورت کہ کاریگری کی تعریف نہیں کی جا سکتی تھی۔ دوسرا ایک ہاتھی دانت کا صندوقچہ لئے ہوئے تھا جس کے کونے اور حاشیے پر سونا جڑا ہوا تھا۔ تعظیماً جُھک کر اُس نے اس صندوقچے کو کھول دیا قیمتی جواہر اور نادر زیورات سے یہ لبالب بھرا ہوا تھا۔

بیگم نے انتہائی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اُس کی آنکھیں ایسی تھیں جیسے کسی چیڑ یا پر سانپ کا جادو چل گیا ہو۔ وہ مشرقی شہزادے کی آنکھوں پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کے لئے یہ شہزادہ آرزوؤں کا مرکز تھا، اس کے خواب کی تعبیر تھا، وہ تھا جس کے لئے اُس کی رُوح تڑپ رہی تھی۔ رومان، محبّت، قوت، اسرار۔ بیگم بولی۔ مگر اُس کی آواز کانپ رہی تھی اور اُس کے الفاظ مدّھم اور رُک رُک کر اُس کے مُنہ سے ادا ہوئے:-

"تم کون ہو اور یہاں کیا چاہتے ہو؟ مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟"

فاؤسٹ نے، اور یہی وہ شہزادہ تھا جس کا یہ جلوس تھا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اُس کی آنکھوں نے الفاظ سے زیادہ تیز اور موثر زبان میں جواب دیدیا۔ اُس نے دُور دُور مشہور پرما کی بیگم کے حُسن کا شُہرہ سُنا تھا، اور میفسٹو نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ یورپ کی حسین ترین عورت تیری ہو گی۔ بیگم تو اُس کی توقعات سے کہیں زیادہ نکلی۔ محبّت کی زنجیروں نے دونوں کو جکڑ لیا تھا۔

چبوترے کے پیچھے سے ایک شکل بیگم کے قریب آئی۔ یہ ایک شہزور ہستی تھی۔ سیاہ لباس، کالا لمبا سا چُغہ، ترچھی بھنویں، سیاہ مقنع میں ایک لمبا سُرخ پَر لہراتا ہوا۔ کسی نے اُسے داخل ہوتے نہیں دیکھا اور نہ کسی کو معلوم کہ وہ کہاں سے آیا۔ بیگم کے سامنے وہ ادب سے جُھکا اور خاکساری سے بولا:-

"دُنیا کی بےمثل حسینہ کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرنے کی غرض سے میرا آقا

آپ کیلئے اپنی سلطنت کے خزانے لایا ہے۔"

[illegible]س نے ان الفاظ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور برابر فاوسٹ کی طرف [illegible]ی۔ اُس کی پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں اور لب سے لب جدا تھا گویا سکتہ ہیں [illegible]وسٹ اُس کی ٹکٹکی کا جواب دے رہا تھا اور اس میں اُس کی جوانی کا [illegible]ور جذبات کا طوفان شامل تھا۔

وہ اپنے جھولتے ہوئے ریشمی تخت سے اُٹھا اور کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ جوانی، طاقت اور نزاکت کا مجسّمہ معلوم ہو رہا تھا۔ چہرے سے بے خوفی اور معصومیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ چالاکی اور فریب اس کے پاس ہو کر نہیں گزرا تھا۔ طینت میں جوانی کا تخیل اور ہمدردیاں شامل تھیں۔ پیچھے جو حبشی کھڑے تھے اُنہیں اشارہ کیا۔ وہ کائی کی طرح پھٹ گئے اور اُن میں سے ایک آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا کنول کا پھول تھا جو خالص سونے کا بنا ہوا تھا۔ اسے اُٹھائے وہ نہایت احتیاط و احترام سے چل رہا تھا۔ وہ فاوسٹ کے سامنے آکر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ فاوسٹ نے ایک اور اشارہ کیا اور وہ حبشی پلٹ کر آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اس کنول میں سے روشنی کی مدھم شعاعیں نکل رہی تھیں جن سے حبشی کا چہرہ گلابی روشنی میں نہا رہا تھا۔ یہ روشنی قدم قدم پر گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے فاوسٹ چل رہا تھا۔ جب نواب بیگم کے قریب غلام

پہونچ گیا تو ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا تا کہ فاؤسٹ آگے آجائے۔

فاؤسٹ نواب بیگم کو پُرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے حبشی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُس نے طلائی کنول اس کے ہاتھ میں احتیاط سے دیدیا۔ اسے لیکر فاؤسٹ نے اپنے ہاتھ کی ایک حسین گردش کے ساتھ یہ کنول بیگم کی خدمت میں پیش کیا۔ فاؤسٹ نے پھر آغاز سخن کیا آواز میں کچھ تحکّم اور کچھ استدعا تھی:-

"ایک تحفہ، حسین ترین تحفہ جو صرف آپ کے لائق ہے"

بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اس کنول کی پنکھڑیاں باہر کے رُخ کھل گئیں اور ایک بیش قیمت جوہر پارہ نظر آیا جس کی چمک سے چکا چوند پیدا ہوتی تھی۔ یہ ایک خون کے رنگ کا یاقوت تھا جو مُٹھی کے برابر تھا۔ شکل میں بیضوی تھا۔ اس کے داسے کچھ اس طرح بنائے گئے تھے اور اندرونی آگ سے کچھ اس طرح دَمکتا تھا کہ خون کے رنگ کا شعلہ اس میں سے نکلتا معلوم ہوتا تھا اور یہ شعلہ اس طرح گھٹتا بڑھتا تھا جیسے جہنّم کے شیاطین اسے اپنے سانس سے سُلگا رہے ہوں۔

یہ پتھر اس دُنیا کی چیز معلوم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اسے دیکھنے والے سب سرگشتہ وحیران تھے۔ فلورنسی شوہر، ملازمین، بیگم کے حاضر باش سب عارضی طور پر اندھے ہو گئے تھے، گویا کسی دھماکے سے پیچھے جا گرے تھے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپائے ہوئے تھے یا اپنے بازوؤں میں سر چھپائے رکھے تھے یہاں تک کہ اُن کی بصارت اور اُن کا احساس دوبارہ عود کر آیا۔

بدی کے اس رنگین جوہر پارے کو ایک دم سے دیکھکر نواب بیگم پر کوئی خوف طاری نہیں ہوا اور نہ وہ جھجکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اُس کی فطرت میں بھی کوئی ایسا ہی جُزو تھا جو اس جوہر کی صدائے فریب پر لبیک کہہ رہا تھا۔ اُس کا شوہر جسمانی طور پر سرنگوں ہوگیا تھا مگر نواب بیگم رُوحانی طور پر نگوں سار ہوچکی تھی۔

فاوسٹ نے کنول کی پنکھڑیاں بند کردیں اور بیگم کی طرف ہاتھ پھیلا دئے۔ اُس نے فاوسٹ کی طرف اپنی لجائی آنکھوں سے اس طرح دیکھا کہ اس سے آرزو، پرستش اور سُپردگی ٹپک رہی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی فاوسٹ کی طرف بڑھی اور ایک آہ کھینچکر اس کی آغوش میں جذب ہوگئی، فاوسٹ نے کہا:-

"پیاری! تیرے حُسن کا شُہرہ دور دراز مُلکوں میں مجھ تک پہونچا۔ میں نے سُنا مگر اُس پر یقین کرنے کی جراَت نہیں کی۔ دُنیا بھر میں تیرا ثانی نہیں ہے۔ محبّت کا واسطہ دیکر میں تجھے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آ"

بیگم نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا "میں نے تیرے خواب دیکھے ہیں اور اپنی نیند میں تیری آواز سُنی ہے۔ جذبہ، قوت اور جوانی کی آواز میں صرف تیرے لئے پیدا ہوئی تھی۔ میں تیری ہوں، اے میرے آقا۔ بالکل تیری ہوں، ہمیشہ کے لئے لے چل مجھے"

اُنھوں نے گرمجوشی سے ایک دوسرے کو بوسہ دیا۔ پھر پلٹ کر فاوسٹ اپنے انعام کو اُٹھائے تیزی سے زینے پر سے اُترا۔ ایک لمحہ بعد باقی بھی پلٹ گئے اور

دونوں مل کر اس طرح جنگھاڑے گویا نعرۂ فتح بلند کر رہے تھے۔ اُنہوں نے صحن طے کیا پھر دروازہ کھُلنے کی جھنکار سُنائی دی اور خوفزدہ مہمان اِدھر اُدھر سے دَبکے دبکائے باہر نکلے اور شہ نشین کی طرف بڑھے۔

جو لوگ شہ نشین پر تھے اُن میں بھی آہستہ آہستہ ہلچل مچی، گویا وہ نیند سے چونک رہے تھے۔ فلورنسی نوشہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور چاروں طرف حیرانی سے دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ کچھ یاد کر کے اُس کے چہرے پر سُرخی سی آئی' وہ اُچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ خالی چبوترے کی طرف افسوس سے دیکھا اور سامنے میفسٹو کھڑا نظر آیا جو اُسے تمسّخر و حقارت سے دیکھ رہا تھا۔

ایک ایسی چیخ مار کر جس میں تکلیف، غصّہ مظلومیت اور خونِ محبّت سب ہی شامل تھے مجروح شوہر نے اپنی نوک دار تلوار کھینچی اور اُس شخص پر جھپٹ پڑا جو کھڑا اُس کا مذاق اُڑا رہا تھا کیونکہ اس کے دل نے کہا کہ یہی وہ شخص ہے جو تیری زندگی ویران کرنے کا باعث ہے۔ تلوار سونت کر چیتے کی طرح اُس نے جست لگائی تلوار ٹھیک اپنے نشانے پر لگی اور دل میں قبضے تک اُتر کر پار ہو گئی۔

میفسٹو ایک دھماکے کے ساتھ گرا اور اسی کے ساتھ مدّھم روشنیوں کے شُعلے ایک دم سے بھڑک اُٹھے۔

ایک لمحہ کے لئے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ پھر مجمع میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مُردہ جسم میں سے ایک اور شکل اُبھر رہی تھی جو بتدریج صورت اختیار

کرتی جارہی تھی۔ وہ جھول کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور متشکل ہو جانے کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ میفسٹو مجسّم کھڑا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کرنے سے پہلے وہ کھڑا تھا اور اُس کا پہلا جسم اُس کے قدموں میں مُردہ پڑا تھا۔ ایک جھٹکا دے کر اُس نے مُردہ جسم میں سے تلوار کھینچ لی اور نہایت اطمینان سے بغیر کسی گھبراہٹ کے فاصلے کا اندازہ کر کے سانپ کی طرح بل کھا کر اس نے فلورنسی کے دل میں تلوار اُتار دی۔

وہ چیخ مار کر گر پڑا۔

پھر سب روشنیاں گُل ہو گئیں۔ اور محل اور صحن میں زور کی آندھی چلنے لگی۔

دسواں باب

صُبح جاگ چلی تھی اور اپنی گُلابی اُنگلیوں سے رات کے تاریک پردے ایک طرف ہٹا رہی تھی۔

مدّھم روشنی میں سمندر میں ایک پہاڑی پر میناروں والی گڑھی نظر آئی۔ نیچے کی ایک کھڑکی میں چراغ جل رہا تھا۔ اندر عظیم الشان کمرۂ ضیافت میں ایک رُومی قالین پر محبّ و محبوب فاؤسٹ اور نواب بیگم ہم آغوش پڑے تھے۔

بیگم نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "آہ میرے پیارے تم کس قدر حسین ہو!"

فاؤسٹ نے گرم جوشی سے مُنہ چوم کر جواب دیا "تم اپنا ہی عکس میرے چہرے میں دیکھ رہی ہو۔ میں نے عورتوں میں تم جیسی حسین عورت آج تک نہیں دیکھی۔"

بیگم نے آہستہ سے کہا "لیکن تم ہر عورت سے زیادہ حسین ہو۔ میں مردوں میں طاقت، قوت، شجاعت، فراست اور کئی چیزیں تلاش کرتی تھی۔ سُورما، سیاست داں، شہزادے، عالم، سب کو میں نے جانچا۔ مگر تم میں اِن سب باتوں کو میں جمع

دیکھتی ہوں۔ اور تم حسین بھی ہو۔"

"میرے حُسن کا ذکر مت کرو۔" فاؤسٹ نے کہا۔ "تمہارے حُسن کی عمر دراز ہے کیونکہ اُس کا مسکن مردوں کا دل ہے اور اُس وقت تک زندہ رہیگا جب تک مرد زندہ ہیں۔ مگر میرا حُسن ......" اور یہ کہکر فاؤسٹ نے ایک ٹھنڈا سانس لیا کیونکہ اُسے کوئی ناگوار بات یاد آ گئی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ فاؤسٹ نے بیگم پر جادو کر دیا ہے۔ اس کی نظر پر، اس کے لمس پر، اُس کی آواز پر بیگم کے جسم میں لرزہ پڑ جاتا تھا اُس نے آہستہ سے کہا:۔

"میں نے بغیر سوچے سمجھے ہر چیز تم پر چھوڑ دی ہے۔ مجھے کسی بات کا افسوس نہیں ہے اور نہ آیندہ کبھی ہوگا، چاہے جو کچھ ہو۔ تمہارے پاس بہت دولت تھی مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ میرے پاس اپنی ہی دولت کافی تھی۔ تمہارے پاس عقل و فراست تھی مگر کتابوں اور پُرانے نوشتوں سے میں نے اسے حاصل کر لیا تھا۔ تمہارے پاس طاقت اور دلیری تھی لیکن میں اور بہت سے مردوں کو جانتی ہوں جن میں یہ صفات موجود ہیں۔ مگر اس سب کچھ کے ساتھ، میری جان، تمہارے پاس حُسن تھا اور جوانی۔"

کچھ یاد کرکے وہ چونک پڑا اور بیگم کی آغوش سے نکلنے لگا۔ اسکے دل میں گویا خنجر سا لگا۔ اُس نے اپنے محل میں ریت گھڑی کو رکھے دیکھا اور دیکھا کہ اُوپر کا حصّہ تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ جب سے میفسٹو کے چُنگے پر سے قدم اُتارا تھا اور اس

جادو کی رات میں مبتلا ہوا تھا میفسٹو کے معاہدے کا اُسے مطلق خیال نہیں آیا تھا۔ یاد اُبھر آئی اور جوانی کے حوالے کے ساتھ۔ جوانی کا ذکر اُس سے کیا جا رہا تھا جو ذرا سی دیر میں کمزور بد دل بُوڑھا ہو جانے والا تھا، جس کے تمام پُرانے خیالات مٹ چکے تھے، جس کی کُل سائنس و فلسفے کی پیاس بجھ چکی تھی۔ ایک بڈھا جس کی آرزوئیں اور اُمیدیں غارت ہو چکی تھیں۔ یہ انسان کیا تھا انسان کا چھلکا تھا۔ لیکن ایک بات کا وہ تہیّہ کر چکا تھا اور اُسی پر قائم تھا، اور وہ یہ کہ وقت پورا ہونے سے پہلے میفسٹو سے وہ عہد نامہ واپس لے لیگا جس پر اُس نے اپنے خون سے دستخط کئے تھے۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور بیگم کو بھی اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ پھر شمعدان میں سے ایک شمع نکالی اور اونچی اُٹھا کر بولا۔ "آؤ"

یہ کہہ کر بیگم کو گود میں اُٹھا لیا۔ شمع کی روشنی اُس کے کُھلے ہوئے بالوں، شانوں اور سینے پر پڑ رہی تھی۔ جو زندگی سے کانپ رہا تھا۔ اُس کے حسین چہرے پر محبت کی روشنی چمک رہی تھی، اور اسی طرح اُسے اُٹھائے اُٹھائے چوڑے زینے تک آ گیا۔

جب وہ عالیشان کمرۂ خواب میں پہونچ گیا تو شمع کو ایک شمعدان میں رکھ دیا اور اپنی عاشق زار محبوبہ کو آہستہ سے زمین پر ٹکا دیا۔ اُنھوں نے کانپتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر بڑی گرمجوشی سے گلے ملے کیونکہ محبت درحقیقت اُسے اب ملی تھی۔ اور یہ بیگم سمجھ ہی نہ سکتی تھی کہ محبت بھی اسقدر شدید ہو سکتی ہو کہ ایک انسان کی ہستی پر چھا جائے۔ اب وہ اِس محبت کو چھوڑ رہا تھا، زندگی سے مُنہ موڑ رہا تھا۔

فاؤسٹ سہارا دے کر اُسے بستر عروسی تک لایا۔ وہ اس کے بازو پر پیچھے کی طرف جھکی ہوئی ادھ کھلی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ دونوں کے دونوں غلبۂ محبّت سے نیم بیہوش ہو رہے تھے۔ کوئی ما فوق الفطرت چیز لہریں بن بن کر اُن میں سے گزُر رہی تھی اور اُنہیں اُبھار کر کچھ سے کچھ بنا رہی تھی۔ فاؤسٹ نے مسہری کے زرکار پردے کھینچ دیئے۔ اُسی وقت اس کے کان میں ہلکی مگر صاف آواز آئی۔ "فاؤسٹ"۔

یہ ایک حکم تھا جسے ماننے پر وہ مجبور تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو بیگم کی گرفت سے چھڑایا اور آواز کی سمت میں دوڑا۔

ایک چوڑی سی الماری کے قریب سے جب گزرا تو ایک ہاتھ اس میں سے نکلا جس نے مضبوطی سے اُسے پکڑا اور پیچھے کھینچ لیا۔ یہ ہاتھ میفسٹو کا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریت گھڑی تھی اور دوسرے میں جس سے اُسنے پکڑا تھا وہی ملعون عہد نامہ تھا۔ ـــــــــــ ایک انسانی رُوح کا معاہدہ میفسٹو نے ریت گھڑی کو فاؤسٹ کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ اُوپر کا نصف حصّہ خالی تھا۔

میفسٹو نے عہد نامہ کھولکر پھیلا دیا۔ "دیکھو، میں اپنے قول پر قائم رہا۔ تمہیں جوانی کا ایک دن مل گیا۔ سُورج کی ایک گردش تک تم نے دُنیا کے ہر گوشے پر حکمرانی کی۔ اب بتاؤ کیا اپنا عہد نامہ واپس لینا چاہتے ہو؟" اُس کے چہرے پر تمسخر کی مسکراہٹ تھی اور اُس کی آنکھوں میں بھیانک روشنی چمک رہی تھی۔

فاؤسٹ نے کہا "ایک دن! صرف ایک دن۔ بس ایک دن مجھے اور دیدے"۔

"نہیں۔نمونہ ختم ہو چکا۔ریت ختم ہو چکی۔اب پھر ویسا ہی بڈھا ہو جا جیسا پہلے تھا۔"
اُس کے آخری الفاظ کے ساتھ ہی فاؤسٹ کے قریب ایک سایہ نمودار ہونے لگا۔
یہ بوڑھے فاؤسٹ کی شکل تھی۔لمبی سفید ڈاڑھی جس نے جلدی ہی پوری شکل اختیار کر لی اور اپنی جوان ہستی کی طرف تاسف سے دیکھنا شروع کیا۔اس کے ساتھ ہی فاؤسٹ نے محسوس کیا کہ اسکی طاقت زائل ہو رہی ہے۔اس کے اعضاء کانپنے لگے اور وہ لڑکھڑانے لگا۔گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا اپنے نحیف ہاتھوں کو اُوپر اُٹھایا اور کمزور آواز میں بولا:۔

"میں نے دوبارہ جوانی کا مزہ چکھا۔زندگی بغیر جوانی کے موت ہے۔"
میفسٹو اُسے کھڑا دیکھتا رہا اور خاموش رہا۔
بُوڑھا فاؤسٹ اب سایہ نہیں رہا تھا۔فاؤسٹ گر چکا تھا اور مرنے ہی والا تھا کہ کمزور سرگوشی کی سی آواز سُنائی دی:۔
"جوانی —— مجھے میری جوانی دیدے۔"
میفسٹو کے چہرے پر فتح کے آثار نمایاں ہوئے اور ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگیں۔
"اچھا تو یونہی سہی......لیکن تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میرا ہو گیا۔"

حصّہ دوم

پہلا باب

ایک اُونچے پہاڑ پر، دُنیا کے پوشیدہ مقامات میں سے ایک، جہاں نہ تو دن ہوتا ہے اور نہ رات، جہاں کسی پرندے کی چہکار نہیں سُنائی دیتی، اور جہاں حشرات الارض میں سے کوئی رینگنے والا کیڑا نہیں ہوتا، بلکہ جہاں زمین خود لرزتی ہے، کسی ناپاک اژدھے کی طرح بل کھاتی ہے اور طرح طرح کے انجرات کے مُتعفّن بھبکے اس میں سے نکلتے ہیں ـــــ یہاں میفسٹو کے ایک ارضی مسکن میں فاوسٹ مقیم تھا۔

خلا میں نکلی ہوئی ایک چٹان پر فاوسٹ اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ گھٹنے پر کہنی اور ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکی تھی اور فضائے بسیط پر نظریں جمی تھیں۔ چہرہ غمناک اور پہلے سے بھی زیادہ شکستہ اور افسردہ تھا۔ اپنے بُوڑھے جسم سے نجات پانے کے لئے اُس نے اپنی غیر فانی رُوح کا سودا کیا تھا۔ مگر موجودہ حالت اور بھی زیادہ غیر مطمئن و پریشان کن تھی۔ گذشتہ سب تکلیفوں پر اب نا اُمیدی و مایوسی ـــــ کی تکلیف مُستزاد تھی۔ کیونکہ زندگی کو وہ اپنی فوق الفطرت قوتوں کی وجہ سے اپنی آرزو کے مطابق ڈھال تو سکتا تھا مگر مستقبل میں اس کے لئے زندگی کوئی اُمید نہیں رکھتی تھی۔

نہ تو اس کے لئے زندگی کوئی حیرت زائی رکھتی تھی، نہ اُمید وبیم، نہ معلومات اور نہ محبت واختیار۔ یہ سب باتیں اس لئے خاک میں مل چکی تھیں۔

شیطان اُسے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بولا:۔

"فاؤسٹ تُو مطمئن کیوں نہیں ہے؟ تُو نے لوگوں کی خدمت کی اور سنگسار کیا گیا! حسین سے حسین اور بڑی سے بڑی عورت سے تُو اپنا دل بہلا چکا۔ ازمنۂ قدیم کی حسین ترین عورتیں تیرے آغوش میں مچل چکیں۔ بادشاہ سلیمان سے زیادہ تیرے پاس عقل ودولت ہے۔ پھر بھی کوئی چیز مطمئن نہیں کرتی۔"

فاؤسٹ نے افسردہ آواز میں جواب دیا۔ "میں نے ایک فریب کے عوض تیرے ہاتھ اپنی رُوح بیچی ہے۔"

"کیا تُو اور عورتوں کی خواہش رکھتا ہے۔ جو ان سب سے بھی حسین تر ہوں؟.... کوئی حور؟ کوئی پری؟ جو بھی تو حکم دے میں ماننے کو تیار ہوں۔"

فاؤسٹ نہ تو ہلا اور نہ کوئی جواب دیا۔ خلا پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔

"کیا تو لوگوں کی قسمتوں پر اور بھی زیادہ اپنی طاقت کا مظاہرہ چاہتا ہے؟ جو تو چاہے گا ہو جائیگا، اگر کسی شہنشاہ کا تاج بھی مانگے تو تجھے مل سکتا ہے۔ دیکھ!"

اور میفسٹو کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا تاج دکھائی دیا جو جواہرات سے جگمگا رہا تھا۔

"کیا تُو کسی عظیم الشان سلطنت کا بانی بننا چاہتا ہے؟"

لیکن فاؤسٹ نے جواب نہیں دیا اور نہ کوئی جنبش کی۔

"فاؤسٹ تو گیا تیرے دل میں کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔ایک بھی ۔۔۔ ؟"

فاؤسٹ نے اپنا غمزدہ چہرہ پھیرا اور شیطان کی طرف دیکھا۔

"صرف ایک آرزو ہے میری، میفسٹو۔ اور وہ آرزو ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہے گو میں نے اپنی رُوح کے سب سے گہرے گوشے میں اسے مقید کر دیا تھا"

میفسٹو نے پوچھا۔"اور یہ آرزو کیا ہے ؟" اس کی بھنویں خوفناک حد تک ترچھی ہو گئیں۔

"گھر! اور معصومیت!"

"معصومیت تجھے میسّر نہیں ہو سکتی۔ تیری رُوح میری ہے!"

فاؤسٹ نے مایوسی سے کہا "میں اپنے گرد معصومیت چاہتا ہوں۔ ننھے ننھے چونچال چہرے جن سے لالچ، ہوس اور فریب نہ ٹپکتا ہو۔ مجھے میرے وطن لے چل جہاں میں نے اپنے بچپن کے خوشگوار دن گذارے تھے"

میفسٹو مخالفت و ناپسندیدگی سے بُڑبڑایا۔"وہاں خطرہ ہے۔ میں اب تک فاؤسٹ کے عرفانی جزو کو پوری طرح غارت نہیں کر سکا!"

فاؤسٹ اُٹھکر میفسٹو کے روبرو آکھڑا ہوا۔ اور چیخکر بولا :-

"میری خواہش یہی ہے۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں، مجھے میرے وطن لے چل اور جلدی لے چل!"

دوسرا باب

روڈا میں ایسٹر کا اتوار تھا۔ دن روشن تھا اور سُورج چمک رہا تھا۔ مرد، عورتیں اور بچّے اپنے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بازاروں میں خوب چہل پہل تھی۔ اطمینان و مسرّت کی فضا سب پر چھائی ہوئی تھی۔

ان میں سے زیادہ تر لوگ گرجا کی طرف جا رہے تھے اور سُرخ سُرخ مسکراتے چہروں کے بچّے للی کے پھُول ہاتھوں میں لئے خوش خوش چلے جا رہے تھے۔

دو نووارد پُل پر سے گزر شہر میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کالے رنگ کا توانا شخص تھا جو سیاہ چُغہ پہنے ہوئے تھا۔ سر کے لباس میں ایک لمبا سُرخ رنگ کا پَر لہرا رہا تھا۔ دوسرا ایک نوجوان تھا نہایت حسین، متناسب الاعضاء، لباس ہلکا بسنتی اور نہایت قیمتی ریشم اور مخمل کا تھا۔ یہ دونوں بازاروں میں سے گزرے۔ نوجوان گھروں اور باغوں کو انتہائی ذوق و شوق سے دیکھ رہا تھا گویا پُرانی دوستی کی تجدید کر رہا تھا۔

اُس نے کہا "میفسٹو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زندگی بالکل ساکت ہے۔ اب

بھی بالکل وہی ہے جو پہلے تھا۔"
میفسٹو نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا "کیا اتنے جلدی سب کچھ بھول گئے فاؤسٹ!"
پھر فاؤسٹ کو طاعون کا وہ خوفناک زمانہ یاد آیا جس کو اب ایک پیڑھی گزر چکی تھی اور اُس کے خیال سے اُس کا دل کانپ گیا۔
اُس نے ایک آہ کھینچی اور مسکرا کر میفسٹو کی طرف دیکھا۔
"لیکن زمانے کا پہیہ اُلٹا گھوم گیا ہے۔ میرے گرد ہر چیز ویسی ہی ہے جیسی میری جوانی میں یہاں تھی، اور میں پھر کچھ اپنے آپ کو وہی محسوس کر رہا ہوں۔"
اُن کے قریب سے بڑوں اور بچوں کی ایک بھیڑ گزری اور اُنہیں تعجب کی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ فاؤسٹ نے ایک شخص کو روکا۔ یہ ایک موٹا خوش طبع آدمی تھا اور ایک گدھے پر ایندھن لادے جا رہا تھا۔
"کیوں جناب کیا آج کوئی تہوار ہے جو سب اس قدر خوش ہیں اور عمدہ کپڑے پہنے، للی کے پھول ہاتھوں میں لئے جا رہے ہیں؟"
اُس شخص کے چہرے پر تعجب کے آثار پیدا ہوئے اور حیرت سے پوچھنے لگا۔
"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟ کیا آپ ترکستان سے آ رہے ہیں جو آپ نے مقدس ایسٹر کا نام نہیں سُنا؟"
یہ کہہ کر اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور ہنستا ہوا آگے چل دیا اور آنے والوں کو اُن کی طرف اشارہ کر کے بتاتا گیا کہ اِن عجیب لوگوں کو دیکھو، یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ آج مقدس

ایسٹر ہے۔

اب پھر فاؤسٹ کے دل میں تکلیف دہ خیالات کا ہجوم ہوا کیونکہ اُس نے محسوس کیا کہ فی الحقیقت اُس میں کس قدر تبدیلی ہو گئی تھی اور اپنے ہی وطن کے لوگ اُس سے کس قدر ناآشنا اور اُن کی ہمدردیوں سے وہ کس درجہ محروم تھا۔ اور یہ وہی لوگ تھے جو اُس کے بڑھاپے کے زمانے میں ذرا ذرا سے بچّے تھے۔ اب اُسے وہ نوجوان اور جوان لڑکیاں یاد آئیں جو اُس کی بزرگی و احترام کے زمانے میں زندہ تھیں۔ وہ سب اب یا تو بڈھی کھوڑی ہونگی یا مر کھپ گئی ہونگی۔

یہ دونوں بھی ہجوم کے ساتھ گرجا کی طرف روانہ ہوگئے۔ بچّوں کی خوش خوش باتوں کو سُنکر فاؤسٹ کا احساسِ غم کچھ کم ہوا اور ننھی ننھی بچیوں کو دیکھتا رہا کہ کس احترام سے اپنے مظہرِ پاکیزگی (للی کے پھول) کو اُٹھائے جا رہی ہیں۔

تھوڑی دُور چل کر وہ خوشنما چھوٹے سے گھر کے قریب سے گزرے جس کی جھکی ہوئی چھت سُرخ کھپریل کی تھی۔ اس کے چاروں طرف ایک باغیچہ تھا اور پیچھے کے رُخ ایک بڑا سا تاکستان تھا۔ فاؤسٹ نے اِسے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور میفسٹو کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اُس ہستی سے کس قدر قریب ہے جس کی قسمت اس کی آئندہ قسمت سے اس قدر وابستہ ہے۔ یہ وہ ہستی تھی جس کے لئے فاؤسٹ کی رُوح بھوکی تھی اور ہر لحاظ سے اس کی تشنگیٔ رُوح کو سیراب کرنے کی اہل تھی۔ بلکہ یہ وہ کسوٹی تھی جس پر فاؤسٹ کی رُوح کا آخری کس لگایا جانیوالا تھا۔

یہ حسین مارگریٹ تھی جو اس گھر میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کی دو لمبی لمبی سنہری چوٹیاں گندھی ہوئی تھیں۔ شاداب چہرہ جس سے تازگی اور عمدہ صحت ظاہر ہوتی تھی۔ شفاف نیلی آنکھیں جن میں زندگی اور زندگی کی خوشی ناچتی تھی۔ عمر اُس کی سترہ سے زیادہ نہ تھی، اور ابھی بچپن کے اَلھڑپن سے اس کا قطع تعلق نہیں ہوا تھا۔ بچّوں کے ساتھ پھرتی، اُن کے ساتھ پھُولوں کے ہار گوندھتی۔ گھر میں چلتی پھرتی تو وہ گیت گنگناتی جاتی تھی جو اسکول میں گایا کرتی تھی۔ اُس کے لئے زندگی کا پھُول ابھی کھلنا شروع ہوا تھا۔ جاگتے کے خواب بھی وہ اکثر دیکھا کرتی تھی۔ اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھی رومانی خیالات سے ذہن کو بہلاتی۔

آج ایسٹر کی صبح کو وہ اپنی ماں کے ساتھ اُس کمرے میں تھی جس میں سے بازار نظر آتا تھا، اُس کا لباس سفید تھا اور گرجہ جانے کی تیاری کر رہی تھی آستینیں چُست اور لمبی تھیں جن میں سے اُس کے بھرے بھرے بازوؤں کا سڈول پن ظاہر ہو رہا تھا۔ گلے کے پاس جو جلد نظر آ رہی تھی ملائی کی طرح سفید تھی اور ایسی ہی پاکیزہ جیسی اُسکی نیلی آنکھوں سے نکلنے والی نظر۔

اُس کی ماں کھڑکی کے پاس بیٹھی سی رہی تھی۔ کمرے کی فضا تازہ و معطّر تھی کیونکہ باغ کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کمرے میں چمکدار لکڑی کا سازوسامان تھا۔ برتن صاف ستھرے اور جگمگ جگمگ کرتے۔ فرش دُھلا دُھلایا، داغ دھبّے کا نام تک نہیں۔ یہ سب چیزیں ایسی تھیں کہ اس مسرور و معصوم لڑکی اور اُسکی

شفیق ماں کی اُفتادِ مزاج سے خاص مُناسبت رکھتی تھیں۔

کمرہ طے کرکے وہ اپنی ماں کے برابر آ کھڑی ہوئی اور کھڑکی میں سے بازار میں سے گذرنے والے ہجوم کو غایت دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی:-

"اماں۔ آج صبح کو گرجا میں کتنی بھیڑ ہوگی! دیکھئے وہ بڑی بی تو ہی اپنے ننھے بچے کو لئے جا رہی ہیں اور خیر سے یہ بچہ اپنی ماں سے کم از کم تین گُنا بڑا ہے!" یہ کہہ کر وہ خوشدلی سے ہنسنے لگی۔

"اور اماں ذرا اُن دو اجنبیوں کو تو دیکھئے۔ اُن کا لباس کسقدر قیمتی ہے۔ دیکھئے وہ پرے اُس طرف جا رہے ہیں۔ کاش اُن کے چہرے نظر آ جاتے۔ وہ نوجوان جس کا چُغہ ہلکے بسنتی رنگ کا ہے، وہ تو کچھ اس شان سے چل رہا ہے گویا کہیں کا بادشاہ ہے۔ وہ ضرور بہت خوبصورت ہوگا!"

ماں نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا "جلدی کر بیٹی ورنہ تجھے دیر ہو جائیگی۔ پھر بھلا تجھ جیسی شرمیلی بچی گرجا میں کیسے داخل ہوگی جب سب بیٹھ چکے ہونگے اور خطبہ پڑھا جا رہا ہوگا۔"

اتنا کہہ کر اُس نے لڑکی کو پیار کیا۔ اور بولی "اِس سکون اور پاکیزگی کے دن کی برکتیں تجھ پر ہوں!"

"اور آپ پر بھی پیاری اماں!"

مارگریٹ نے ماں کے قریب جو گلدان رکھا تھا اُس میں سے ایک للی کا پھول

نکالا اور ماں کو بچّوں کی طرح خیر باد کہہ کر جلدی جلدی سیڑھیوں پر سے اُتر کر بازار میں آگئی۔
اُسے ڈر تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے اِس لئے وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتی چلی۔ راستہ میں اُسے گزشتہ سال کا خیال آرہا تھا جب اُس کا بڑا بھائی ساتھ تھا۔ یہ زبردست ہاڑ کا جوان تھا جو شاہی سپاہ میں ملازم تھا۔ اُس کی کمر میں ایک چوڑی سی تلوار لٹکی رہا کرتی تھی۔ جس سے وہ اُسے ڈرایا کرتا تھا۔ اور اس دن وہ کس قدر فخر و پندار کے ساتھ اُس کے پہلو بہ پہلو گئی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی اُسے وہ نووارد یاد آیا جو عجیب شان سے چند منٹ ہوتے اُسکے گھر کے آگے سے گزرا تھا۔
بچپن کے ایسے ہی خیالات میں مُنہمک وہ گرجا پہونچی اور صدر دروازے کی سیڑھیوں کی طرف چلی۔ اس سوچ میں کچھ ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ میفسٹو سے ٹکراتی ٹکراتی بچی جو سیاہ لباس پہنے بازار کے رُخ سیڑھیوں کے قریب دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ ایک دم سے جو اسکا آمنا سامنا ہوا تو مارگریٹ کے سارے خوشگوار خیالات یکلخت منقطع ہوگئے اور اُس کے چہرے پر خوف سا طاری ہوگیا۔ میفسٹو کے چہرے پر حقارت کے آثار تھے۔ وہ اُچھل کر پیچھے ہٹی اور کچھ ایسا سہم اُس پر سوار رہوا کہ ہاتھ میں سے للی کا پھول چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ فاؤسٹ جو میفسٹو کے پیچھے کھڑا تھا جھپٹ کر آگے آیا اور پھول اُٹھا کر بڑے پُرتپاک طریقے سے پیش کیا۔ وہ کچھ زبان سے بھی کہنے والا تھا مگر لڑکی کے چہرے کو جو دیکھا تو اُس کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اور ایسی کہ پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اُس میں کچھ شائبہ خوف کا تھا اور کچھ وہ احساس شامل تھا جو کسی کو پہچاننے میں

ہوتا ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جس چیز کی اُسے تلاش تھی وہ اُسے مل گئی۔ جسے وہ ساری عمر ڈھونڈتا رہا تھا وہ ہستی اُس کے پیشِ نظر تھی۔

مارگریٹ بھی فاؤسٹ سے کچھ کم مُتحیّر نہ تھی۔ ایک لمحہ پہلے وہ میفسٹو کو دیکھکر سہم گئی تھی اور اب اُس ہیبت ناک ہستی کی بجائے ایک اور ہی دلکش ہستی سامنے آگئی تھی ـــــ ایک ہستیِ نور تھی جو حُسن، جوانی، طاقت، اور شجاعت کی مکمل تصویر تھی۔ اِسے وہ اس طرح دیکھ رہی تھی کہ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور لب سے لب جُدا تھا۔

اِن دونوں کے جسم میں ایک کپکپی دوڑ گئی ـــــ شدید جذبات کی کپکپی چند لمحے وہ اسی طرح کھڑے رہے اور یہ لمحے اُن کے لئے پھیلکر اَبدیت بن گئے۔ پھُول پر دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھو رہے تھے، للّی کا پھُول، معصومیت کا مظہر اُن کے درمیان تھا۔

پھر ایک سانس زور سے لیکر اُس نے اس طلسم کو توڑا اور خوفزدہ خرگوش کی طرح وہ سیڑھیوں پر سے اُچھلتی گرجا میں داخل ہو گئی۔

فاؤسٹ بُت بنا اُسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ میفسٹو کی کرخت آواز نے اُسکے خیالات کا سلسلہ کاٹ دیا۔

"بیوقوف سادہ لوح چھوکری جو پادریوں کے پاس بھاگی جا رہی ہے، یہ تیری محبّت کے لائق نہیں۔"

نکالا اور ماں کو بچوں کی طرح خیرباد کہہ کر جلدی جلدی سیڑھیوں پر سے اُتر کر بازار میں آگئی۔
اُسے ڈر تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے اس لئے وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتی چلی۔ راستہ میں اُسے گزشتہ سال کا خیال آرہا تھا جب اُس کا بڑا بھائی ساتھ تھا۔ یہ زبردست ہاڑ کا جوان تھا جو شاہی سپاہ میں ملازم تھا۔ اُس کی کمر میں ایک چوڑی سی تلوار لٹکی رہا کرتی تھی۔ جس سے وہ اُسے ڈرایا کرتا تھا۔ اور اس دن وہ کس قدر فخر و پندار کے ساتھ اُس کے پہلو بہ پہلو گئی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی اُسے وہ نو وارد یاد آیا جو عجیب شان سے چند منٹ ہوئے اُسکے گھر کے آگے سے گزرا تھا۔
بچپن کے ایسے ہی خیالات میں منہمک وہ گرجا پہونچی اور صدر دروازے کی سیڑھیوں کی طرف چلی۔ اس سوچ میں کچھ ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ میفسٹو سے ٹکراتی ٹکراتی بچی جو سیاہ لباس پہنے بازار کے رُخ سیڑھیوں کے قریب دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ ایک دم سے جو اُسکا آمنا سامنا ہوا تو مارگریٹ کے سارے خوشگوار خیالات یکلخت منقطع ہو گئے اور اُس کے چہرے پر خوف سا طاری ہو گیا۔ میفسٹو کے چہرے پر حقارت کے آثار تھے۔ وہ اُچھل کر پیچھے ہٹی اور کچھ ایسا سہم اُس پر سوار ہوا کہ ہاتھ میں سے للی کا پھول چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ فاؤسٹ جو میفسٹو کے پیچھے کھڑا تھا جھپٹ کر آگے آیا اور پھول اُٹھا کر بڑے پُرتپاک طریقے سے پیش کیا۔ وہ کچھ زبان سے بھی کہنے والا تھا مگر لڑکی کے چہرے کو جو دیکھا تو اُس کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اور ایسی کہ پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اُس میں کچھ شائبہ خوف کا تھا اور کچھ وہ احساس شامل تھا جو کسی کو پہچاننے میں

ہوتا ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جس چیز کی اُسے تلاش تھی وہ اُسے مل گئی۔ جسے وہ ساری عمر ڈھونڈتا رہا تھا وہ ہستی اُس کے پیشِ نظر تھی۔

مارگریٹ بھی فاؤسٹ سے کچھ کم متحیّر نہ تھی۔ ایک لمحہ پہلے وہ میفسٹو کو دیکھ کر سہم گئی تھی اور اب اُس ہیبت ناک ہستی کی بجائے ایک اور ہی دلکش ہستی سامنے آگئی تھی ـــــ ایک ہستی نور تھی جو حُسن، جوانی، طاقت، اور شجاعت کی مکمل تصویر تھی۔ اِسے وہ اس طرح دیکھ رہی تھی کہ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور لب سے لب جُدا تھا۔

اِن دونوں کے جسم میں ایک کپکپی دوڑ گئی ـــــ شدید جذبات کی کپکپی چند لمحے وہ اسی طرح کھڑے رہے اور یہ لمحے اُن کے لئے پھیلکر اَبدیت بن گئے۔ پھول پر دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھو رہے تھے، للی کا پھول، معصومیت کا مظہر اُن کے درمیان تھا۔

پھر ایک سانس زور سے لیکر اُس نے اس طلسم کو توڑا اور خوفزدہ خرگوش کی طرح وہ سیڑھیوں پر سے اُچھلتی گرجا میں داخل ہو گئی۔

فاؤسٹ بُت بنا اُسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ میفسٹو کی کرخت آواز نے اُسکے خیالات کا سلسلہ کاٹ دیا۔

"بیوقوف سادہ لوح چھوکری جو پادریوں کے پاس بھاگی جا رہی ہے۔ یہ تیری محبّت کے لائق نہیں۔"

فاؤسٹ نے غصّہ سے پلٹ کر دیکھا اور چیخ کر بولا:-

"دفع ہو یہاں سے۔ پیار محبت اور جسم کی خواہشات کا رونا ختم کر۔ مجھ میں نئی نئی آرزوئیں پیدا ہو رہی ہیں۔ دُنیا میں اور طرح کی اُمیدوں کا رنگ جھلک رہا ہے۔ اس میں وہ حُسن ہے جو مجھ میں فنا ہو چُکا ہے ۔۔۔ معصومیت"۔

میفسٹو نے اُسے تیوری چڑھا کر دیکھا مگر اُس کا جواب گرجا کے باجے کی آواز میں دب کر رہ گیا۔ سب مل کر حمد گا رہے تھے اور ان سب میں بچوں کی صاف معصوم آوازیں الگ سُنائی دے رہی تھیں۔

"خدا کی حمد و ثنا کرو جو زبردست بادشاہوں کا بادشاہ ہے"۔

میفسٹو نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں۔ اُس کے چہرے پر نفرت اور خوف کی شکنیں پڑ گئیں اور گرجا کے قُرب سے بھاگ کھڑا ہوا۔

تیسرا باب

اِدھر تو مارگریٹ اپنے نئے ہیجان کو عبادت میں تسکین دینے کی کوشش کر رہی تھی اور اُدھر اس کی ماں پر بھی ایک غیر متوقع واقعہ کی وجہ سے اِس سے بھی زیادہ ہیجانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

وہ کھڑکی کے قریب اپنے کام میں منہمک بیٹھی تھی، ایک لمبا چوڑا نوجوان فوجی لمبی لمبی ڈگیں بھرتا بازار میں سے آ رہا تھا۔ اُسکے پہلو میں ایک بڑی سی تلوار تھی اور چمڑے کے سینہ بند کی وجہ سے دیو کی طرح سینہ تنا ہوا تھا۔ ماں نے دیکھا کہ باغیچے کی روش پر آدمی کیا ایک پہاڑ کا پہاڑ چلا آتا ہے۔ اور پھر دروازہ زور سے کھلا اور ایک گرجدار آواز سُنائی دی۔ دیکھا تو سامنے اس کا بیٹا ویلنٹین اس طرح کھڑا ہے کہ ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں اور خوشی سے آنکھیں چمک رہی ہیں۔

"چھٹی امّاں! چھٹی۔ ہو ہو!"

"ویلنٹین! میرے بچے!"

ماں کے مُنہ سے گھُٹی ہوئی آواز میں یہ الفاظ نکلے اور ان میں خوشی، تعجب، محبت

اور سکون سب ہی کچھ تھا۔

ایک ہی چھلانگ میں اُس نے اپنی ماں کو گود میں اُٹھا لیا تھا اور اِتنا اُونچا کیا کہ چھت سے سر جا لگا۔

"ہائیں اماں۔ واللہ تم تو وزن میں کچھ کم ہوتی جا رہی ہو۔"

یہ کہہ کر اُس نے ماں کو زمین پر ٹکا دیا اور خوب ہنسا۔

"میرا بچّہ! میرا ننھا بچّہ!" اُس نے غمناک مُسکراہٹ سے کہا۔ "میرے اللہ نے مجھے ایسٹر کا کیسا اچھا تحفہ بھیجا ہو۔"

"اماں پورے تین ہفتے تمہارے اور مارگریٹ کے ساتھ گزرینگے۔ میری خوبصورت مارگریٹ، کہاں ہے وہ؟"

"وہ تو گرجا گئی ہوئی ہے ایسٹر کی عبادت کے لئے۔ بس اب آتی ہی ہوگی۔"

"آہ! کوئی چیز میرے یہاں چُبھ رہی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ سینہ بند میں ڈالا اور کھینچ تان کر کوئی چیز نکالی۔ پھر اپنی بڑی ساری مٹھی ماں کے دونوں ہاتھوں میں رکھکر کھولی تو اُس میں ایک سونے کا بروچ تھا۔

"یہ بڑی دُور سے آیا ہے اماں۔ برانڈنبرگ سے۔ اور میرے ساتھ ساتھ اس پر بھی عجیب عجیب واقعات گزر رہے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر کچھ بھولی ہوئی باتوں کی یاد اُبھر آئی۔

تھوڑی دیر تک دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ویلنٹین اپنے واقعات وسانحات

سُناتا رہا اور شہر میں جو اُس کے دوست تھے اُن کے حالات پوچھتا رہا۔

اتنے میں باغیچے کے دروازے کا کھٹکا کھلنے کی آواز سُنائی دی اور اُنھوں نے مارگریٹ کے بھاگ کے آنے کی آواز سُنی۔

اُس کی ماں بولی "آج یہ مارگریٹ کو کیا ہوگیا؟ یہ تو جب کبھی گرجا سے واپس آتی ہے تو ہمیشہ مجھے دُور ہی سے آواز دیتی ہے۔ شاید آج اُس کا جی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ تم یہیں رہو ویلنٹین۔ میں اُس کے پاس ہوکر آتی ہوں۔"

مارگریٹ اپنے کمرے میں پہونچکر کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی کھڑکی میں سے باہر کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کوئی خواب دیکھتا ہو۔ مگر آج اس کے خیالات کچھ اور ہی تھے۔ وہ نہیں تھے جن میں وہ پہلے کھوئی سی رہتی تھی۔ صبح جو واقعہ پیش آیا تھا اُس کی وجہ سے اُس کے خیالات میں ہیجان تھا۔ دل میں نئے نئے خیالات کا طوفان تھا۔ یہ خیالات بڑے عجیب وغریب تھے مگر یہ اُن سے خائف تھی عبادت کے دوران میں اُس نے کوشش کی تھی کہ اُس شہزادے (وہ اُسے اپنے دل میں یہی کہتی تھی) کے خیال کو دل میں نہ آنے دے مگر اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ گرجا سے نکلنے کے بعد اُسے پھر وہ باہر نظر آیا تھا اور وہ اس کے قریب سے شرمائی ہوئی جلدی جلدی گزر گئی تھی۔ گھر آتے ہوئے چلنے میں وہ دوڑنے لگتی تھی اور یہ خیال دلنشین ہو رہا تھا کہ شہزادہ اور اُس کا ساتھی اُس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ کھڑکی میں سے ڈرتے ڈرتے اُس نے جھانک کر دیکھا۔ مگر جب پیچھے اُسے کوئی نظر نہ آیا

تو اطمینان کے ساتھ ایک طرح کی مایوسی بھی محسوس کی۔
ماں کمرے میں آئی تو مارگریٹ سیدھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سر جھک گیا گویا کوئی شرمناک بات اُس کے چہرے پر دیکھی جا سکتی تھی۔
ماں نے محبت سے پوچھا۔ "مارگریٹ میری بچّی، تجھے کوئی دُکھ درد تو نہیں ہے؟"
اُس نے شرما کر مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "امّاں، کچھ عجیب خلجان سا طبیعت میں ں وقت ہی۔ جاتا رہے گا۔"
"اچھا تُو نیچے آجلدی۔ تجھے گود میں لینے کے لئے ایک مرد کھڑا ہے۔"
یہ کہکر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
مارگریٹ کو دھکّا سا لگا اور تعجّب سے چونک پڑی۔ اُسکے ذہن میں "شہزادے" ہی کا تصوّر تھا اور وہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے لرزتی کانپتی سیڑھیوں پر سے اُترنے لگی اور سوچنے لگی کہ اگر شہزادہ ہی ہوا تو اُسے دیکھکر بھاگ جائیگی۔ جب دروازہ کھُلا اور خوشی کی آواز سُن کر اپنے بھائی کو دیکھا تو ایک لمحہ کے لئے وہ بھونچکّی سی ہو گئی اور تعجب سے اُسے اس طرح گھُورنے لگی جیسے کسی اُمید کے یکلخت مِٹ جانے پر کوئی دیکھے۔ پھر وہ خوشی سے چیختی اپنے بھائی کی طرف دوڑی۔
"ویلنٹین! میرے پیارے بھائی!"
بھائی نے بہن کو گلے لگایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑے سے بھُورے ریچھ کی آغوش میں کوئی پھُول ہے۔ پھر اپنے سے جُدا کر کے ایک قدم کے فاصلے پر

کھڑا کر دیا اور اُسے دیکھ دیکھکر خوش ہونے لگا۔ اور ہنس کر بولا:۔

"واللہ! تُونے وہ جادو کا سیب کھا لیا ہے جس سے حُسن بڑھتا ہے۔ یاد ہے نہ تجھے وہ سیب، جس کی کہانی میں تجھے چھٹپن میں سُنایا کرتا تھا۔ اماں۔ روڈا میں اس سے خوبصورت لڑکی تو کوئی اور ہوگی نہیں، اب جلدی ہی اس سے شادی رچانے کے خواہشمند پیدا ہوجائیں گے۔"

مارگریٹ کا چہرہ شرم وحیا سے تمتمانے لگا۔ اتنے ہی میں اُسکے بھائی نے ایک چاندی کی زنجیر اُس کی کلائی میں ڈال دی۔ اس میں ایک ننھا سا صلیب آویزاں تھا۔ اس تحفے کو دیکھکر مارگریٹ خوشی سے چیخنے لگی:۔

"بھائی آپ کس قدر مہربان ہیں۔ میں اسے ہمیشہ پہنے رہونگی اور جب آپ چلے جائیں گے تو اسے دیکھکر آپ کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ بھائی ویلنٹین، آپ ہمارے ساتھ کتنے دنوں تک رہیں گے؟"

"تین ہفتے لیکن ننھی بہن۔ ان تین ہفتوں میں ہم خوب خوشیاں منائیں گے۔ اور ایسی خوشیاں کہ ان دنوں کو ہم ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

اس کے بعد ہی ایک حقارت آمیز قہقہے کی آواز بازار میں سُنائی دی، گویا اِس کے جواب ہی میں یہ قہقہہ لگایا گیا تھا۔ اور کھڑکی میں سے اُنھوں نے اپنی دونوں نوواردوں کو جاتے دیکھا۔ یہ قہقہہ اُس نے لگایا تھا جس کا لباس سیاہ تھا۔

ویلنٹین کو گھر آئے ہوئے کوئی دو گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ گھر کے پیچھے

تو اطمینان کے ساتھ ایک طرح کی مایوسی بھی محسوس کی۔

ماں کمرے میں آئی تو مارگریٹ سیدھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سر جھک گیا گویا کوئی شرمناک بات اُس کے چہرے پر دیکھی جا سکتی تھی۔

ماں نے محبت سے پوچھا۔ "مارگریٹ میری بچّی، تجھے کوئی دُکھ درد تو نہیں ہے؟" اُس نے شرما کر مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "امّاں، کچھ عجیب خلجان سا طبیعت میں س وقت ہی۔ جاتا رہے گا۔"

"اچھا تو نیچے آ جلدی۔ تجھے گود میں لینے کے لئے ایک مرد کھڑا ہے۔"

یہ کہکر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

مارگریٹ کو دھکّا سا لگا اور تعجّب سے چونک پڑی۔ اُسکے ذہن میں "شہزادے" ہی کا تصوّر تھا اور وہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے لرزتی کانپتی سیڑھیوں پر سے اُترنے لگی اور سوچنے لگی کہ اگر شہزادہ ہی ہوا تو اُسے دیکھکر بھاگ جائیگی۔ جب دروازہ کھُلا اور خوشی کی آواز سُن کر اپنے بھائی کو دیکھا تو ایک لمحہ کے لئے وہ بھونچکّی سی ہو گئی اور تعجب سے اُسے اس طرح گھُورنے لگی جیسے کسی اُمید کے یکلخت مِٹ جانے پر کوئی دیکھے۔ پھر وہ خوشی سے چیختی اپنے بھائی کی طرف دوڑی۔

"ویلنٹین! میرے پیارے بھائی!"

بھائی نے بہن کو گلے لگایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑے سے بھُورے ریچھ کی آغوش میں کوئی پھُول ہے۔ پھر لپٹنے سے جُدا کر کے ایک قدم کے فاصلے پر

کھڑا کر دیا اور اُسے دیکھ دیکھکر خوش ہونے لگا۔ اور ہنس کر بولا:۔

" واللہ! تُو نے وہ جادو کا سیب کھا لیا ہے جس سے حُسن بڑھتا ہے۔ یاد ہے نہ تجھے وہ سیب، جس کی کہانی میں تجھے چھٹپن میں سُنایا کرتا تھا۔ اماں۔ روڈا میں اس سے خوبصورت لڑکی تو کوئی اور ہو گی نہیں، اب جلدی ہی اس سے شادی رچانے کے خواہشمند پیدا ہو جائیں گے۔"

مارگریٹ کا چہرہ شرم و حیا سے تمتمانے لگا۔ اتنے ہی میں اُسکے بھائی نے ایک چاندی کی زنجیر اُس کی کلائی میں ڈال دی۔ اس میں ایک ننھا سا صلیب آویزاں تھا۔ اِس تحفے کو دیکھکر مارگریٹ خوشی سے چیخنے لگی:۔

" بھائی آپ کس قدر مہربان ہیں۔ میں اِسے ہمیشہ پہنے رہونگی اور جب آپ چلے جائیں گے تو اِسے دیکھکر آپ کی یاد تازہ ہوتی رہے گی۔ بھائی ولینٹین، آپ ہمارے ساتھ کتنے دنوں تک رہیں گے؟"

" تین ہفتے لیکن ننھی بہن۔ ان تین ہفتوں میں ہم خوب خوشیاں منائیں گے۔ اور ایسی خوشیاں کہ اِن دنوں کو ہم ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔"

اس کے بعد ہی ایک حقارت آمیز قہقہے کی آواز بازار میں سُنائی دی، گویا اِس کے جواب ہی میں یہ قہقہہ لگایا گیا تھا۔ اور کھڑکی میں سے اُنھوں نے اپنی دونوں نوواردوں کو جاتے دیکھا۔ یہ قہقہہ اُس نے لگایا تھا جس کا لباس سیاہ تھا۔

ولینٹین کو گھر آئے ہوئے کوئی دو گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ گھر کے پیچھے

باغیچے کی آڑ میں فاؤسٹ اور میفسٹو کھڑے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔
"اس چھوکری کو کسی بیوقوف پادری کے لئے چھوڑ۔ یہ تیرے لائق نہیں ہے۔ میں تجھسے کہتا ہوں کہ تیرے اس جذبے کا نتیجہ برا نکلے گا۔" میفسٹو فاؤسٹ کو یہ بات جما رہا تھا۔
فاؤسٹ بولا۔ "یہ کوئی وقتی جذبہ نہیں ہے جو مجھے اکسا رہا ہے۔ یہ محبّت ہے۔ جسے میں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اب محسوس کیا ہے۔ اس دنیا میں سوائے مارگریٹ کے اور کچھ نہیں چاہیئے۔"
"یہ نہیں۔ بیں اور عورتیں تیری خواہش پوری کرنے کے لئے تلاش کروں، اور وہ عورتیں اس سے کہیں زیادہ حسین، لائق اور عقلمند ہونگی۔"
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میفسٹو اس لڑکی کی دراندازی کی وجہ سے بہت خائف تھا، گویا اس کے ارادوں اور تدابیر میں یہ لڑکی حائل ہو رہی تھی۔
فاؤسٹ نے کہا۔ "میں مارگریٹ سے محبّت کرتا ہوں اور صرف مارگریٹ سے۔"
"جی ہاں مجھے خوب معلوم ہے۔" میفسٹو نے ناراضگی سے کہا۔
"مجھے بس یہی لڑکی چاہیئے۔ جو حکم میں تجھے دیتا ہوں وہ پورا کر۔"
"تو نے حکم دیا ہے اور وہ پورا ہوگا۔ لیکن فاؤسٹ پہلے اپنی طرف دیکھ کیونکہ یہ تیرے لئے اچھی فال نہیں ہے....... اور لڑکی کے لئے بھی ـــــ"
یہ کہکر میفسٹو نے اپنے سیاہ چغہ میں سے ایک برنزی بکس نکالا اور فاؤسٹ

کی طرف بڑھایا۔

"دیکھ!" اتنا کہہ کر اُس نے اُس کا کھٹکا دبایا اور ڈھکنا اُچھل کر کھل گیا۔ اُس میں ایک سونے کی زنجیر تھی، سیدھی سادی مگر بڑے نازک کام کی۔

میفسٹو بولا۔ "یہ سُنہری زنجیر اُسے اور تجھے وابستہ کرے گی۔ بس ایک دفعہ اس کے گلے میں یہ پڑ جاتے تو پھر تم دونوں کے مقسوم اس میں مقیّد ہو جائیں گے۔"

میفسٹو نے بکس بند کر کے پھر اپنے چُغے میں رکھ لیا۔ باغیچے میں سے گزر کر گھر کی کھڑکی کے قریب پہونچا۔ پہلے اندر جھانک کر دیکھا اور پھر دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو گیا۔ اندر آ جانے کے بعد سیڑھیوں پر سے چُپکے چُپکے گزرتا ہوا مارگریٹ کے کمرے تک پہونچ گیا۔ وہاں اُس کے چھوٹے سے صاف سُتھرے بچھونے کو دیکھا اور اُس کی برف جیسی چادر کو دیکھکر پیشانی پر حقارت کی شکنیں پڑ گئیں۔ اس کے قریب سے گزر کر کھڑکی کے قریب جو سنگھار میز رکھی تھی اس کی دراز کھولی، اتنے میں سامنے مقدّس مریم اور بچّہ کا چھوٹا سا مجسّمہ نظر آیا۔ میفسٹو کے چہرے پر بَل پڑ گئے اور اُس نے اپنی نظریں اُدھر سے پھیر لیں اور اس طرح کترا کر پیچھے ہٹا گویا انتہائی نفرت کی وجہ سے وہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ پھر مجسّمہ کی طرف سے پیٹھ کر لی مگر اب بھی بےچین تھا۔ جُھک کر اُس نے مارگریٹ کی خاص دراز کھولی اور اُس میں اُس بچّی کی عزیز چیزیں دیکھکر ہنسا۔ ایک ایک کر کے اُس نے سب درازیں کھولیں اور بند کر دیں۔ سب سے اُوپر کی دراز میں اُس نے بکس رکھدیا اور اُسے کھلا چھوڑ دیا۔ اِس کے بعد

میفسٹو وہاں سے روانہ ہوا اور چلتے چلتے مقدّس مجسمہ کو ایک نظر اور دیکھا تو چہرے کے خدوخال سے شدید نفرت ٹپکنے لگی۔

وہ گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ مارگریٹ اُچھلتی کودتی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ آج اُس کے جذبات بالکل نرالے تھے۔ وہ خوش تھی لیکن طبیعت میں خلجان بھی تھا۔ بھائی کے غیر متوقع طور پر آجانے سے اور خوشیاں منانے کی جو تجویزیں کی گئی تھیں اُن کی وجہ سے وہ مسرور تھی۔ لیکن شہزادے کا خیال آتے ہی طبیعت میں انتشار پیدا ہو جاتا تھا۔ دل میں اُمنگ پیدا ہوتی مگر اس کے ساتھ ہی دہم ہو کر رہ جاتی تھی۔ ابھی باچھیں کھل رہی ہیں، ابھی مُنہ سُست گیا۔ ابھی رُوح میں شادابی و تازگی ہے، ابھی خشکی اور مُردنی۔

کھڑکی کے قریب وہ اپنی کرسی پر بیٹھنے چلی کہ اُس کی نظر ایکدم سے کُھلی ہوئی دراز پر پڑی۔ وہ اُسے بند کرنے کو ہوئی کہ بکس کا کنارہ نظر آیا۔ فوراً ہی اُسے باہر نکال کر تعجّب سے دیکھنے لگی۔ اس کا اُسے یقین تھا کہ جب کمرے میں سے گئی تھی تو دراز بند تھی۔ شاید بھائی نے متعجب کرنے کے لئے یہ تحفہ رکھدیا ہو۔ اُس کی کچھ عادت بھی ایسی ہے یا پھر خالہ مارتھا نے ایسٹر کا تحفہ اس طرح چُپکے سے رکھدیا ہو۔

لیکن اِس خود استفساری کے دوران میں اسے کچھ یقین سا تھا کہ ہو نہ ہو اُسکے شہزادے ہی نے اُسے یہ تحفہ بھیجا ہے گو اُسکے امکان پر غور کرنے کی اُس میں

جُراَت نہ تھی۔

وہ اِسے کھڑکی کے قریب لے گئی اور اُسکے نقش ونگار کو بڑھتی ہوئی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

ڈھکنے پر زندگی کا درخت بنایا گیا تھا اور اُس کی ذی حیات ٹہنیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں اور ان میں سے بن دیبیوں اور بن مانسوں کے سر اس طرح نکلے ہوئے تھے جیسے جھانک رہے ہوں۔

مارگریٹ نے بکس کے وزن کا اندازہ ہاتھ سے لگایا اور اسکے ڈھکنے کو کھولنے کی کوشش کی بکس مضبوطی سے بند تھا۔ پھر یکایک اس پر خوف طاری ہوگیا اور اُس نے گھبرا کر اسے دراز میں رکھدیا۔ اُسے اپنے گرد بدی کا اثر محسوس ہوا اور یہ بدی ایسی تھی کہ جو پُراسرار بھی تھی اور دلکش بھی۔ مگر وہ کوشش کے باوجود اُس نامعلوم چیز کی پُراسرار دلکشی کو رَد نہ کرسکی جو بکس میں بند تھی۔ اُس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھنا شروع کیا تاکہ راہگیروں کو دیکھکر اس کا خیال بٹ جائے لیکن یہ خیال ایک لمحے کے لئے بھی اُس کے دل سے محو نہ ہوا کہ یہ تحفہ اُسی حسین نوجوان نے بھیجا ہے۔ یہاں تک کہ بازار کا منظر اُسکے لئے بالکل بے معنی ہوگیا۔ روشنی اور زندگی کے دُھندلے منظر اس کے ذہن میں ناچنے لگے اور ان سب میں وہ اور شہزادہ ہر جگہ یکجا نظر آتے تھے اور وہ مسرت انگیز خلجان جو پہلے خفیف تھا اب شدید ہوتا گیا۔ اُس کی مُٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور جسم لرز رہا تھا۔ ایک معصوم شیریں مُسکراہٹ

لبوں پر تھی۔

پھر وہ کپکپانے لگی اور جاگتے کے خواب سے چونکی اور پھر دراز کی طرف نظر ڈالی۔
رکی اور ڈرتے ڈرتے اُس نے پھر بکس کو اٹھا لیا، میز پر اُسے رکھا اور جلدی
ہاتھ پھیر کر اُس کھٹکے کو تلاش کرنے لگی جس سے ڈھکنا کھلتا تھا۔ ایک بن مانس
پر جو اُنگلی کا دباؤ پڑا تو وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور ڈھکنا اُچھل کر کھل گیا۔ سنہری
اور اس کے دل کی شکل کے آویزے کو دیکھکر وہ جھجک گئی۔ اس سے پیشتر اُس
ی ایسی چیز نہیں دیکھی تھی جسے دیکھکر خوشی سے وہ بے آپے ہوگئی ہو۔ وہ دیر
اُسے گھورتی رہی۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ سینے پر ہاتھ بھینچے ہوئے تھے، وفورِ مسرت
سے یہ کیفیت کہ جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ بڑی کوشش سے اُس نے اپنا سر پھیرا اور
بکس کو بند کر دیا۔ بیچین ہو کر وہ اپنے چرخے کی طرف آئی اور بے سوچے سمجھے اُسے
چند بار گھمایا پھر جیسے کسی نے مجبور کیا ہو وہ منہمک چہرے اور چمکتی آنکھوں سے دراز
کے پاس گئی اور جلدی سے بکس نکال کر اُسے کھولنے لگی۔

اُسی وقت سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سُنائی دی۔ اُس کی ماں داخل
ہوئی اور مارگریٹ نے ڈرے ہوئے بچّے کی طرح گھبرا کر جلدی سے بکس کو دراز میں
ٹھونس دیا اور تیزی سے پلٹ کر پیچھے ہاتھ کئے کھڑی ہوگئی تاکہ آنے والے کو دیکھ سکے
اور دراز کو دھکیل کر بند کر دیا۔

ماں کہنے لگی۔ "مارگریٹ میری بچّی۔ آج تجھے کیا ہوگیا ہے؟ صبح کو تو خوش تھی

اور گا رہی تھی، لیکن اب تو خاموش ہے۔ نہ بولتی ہے، نہ کھاتی ہے اور آکر اپنے کمرے میں بند ہو بیٹھی، چل۔ ویلینٹین ابھی اپنے دوستوں کے پاس سے واپس آتا ہوگا۔ مٹھاس اُسے بچپن سے بھاتی ہے چلکر ذرا اُسے چکھ لے۔ آ۔"

"اماں۔ بھائی کے ایک دم سے آجانے کی وجہ سے طبیعت میں ہیجان ہوگیا، اور کچھ اور بھی ہے۔ ذرا میں خالہ مارتھا کے ہاں ہو آؤں۔ جنگل کی ہوا سے طبیعت کو سکون ہوجائیگا۔"

اُس نے رُک رُک کر بات پوری کی اور ماں نے پریشان ہوکر اُس کی طرف دیکھا، پھر مسکرا کر بولی :-

"ہاں بیٹی خوشی سے جاؤ۔ مگر جانے سے پہلے ذرا مٹھاس چکھتی جانا۔"

ماں یہ کہہ کر چلی گئی اور جاتے ہوئے اُس نے پلٹ کر مسکراتے ہوئے دیکھا مگر اُس کا دل پریشان تھا۔

جب وہ چلی گئی تو مارگریٹ نے جلدی سے دراز میں سے بکس نکالا اور رومال میں لپیٹ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے کوئی بات چھپائی تھی۔ دھوکہ دینے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

سیڑھیوں پر سے دوڑتی ہوئی وہ باغیچے میں آئی اور ڈرتے ڈرتے ایک نظر چاروں طرف ڈال کر سیب کے درخت کی ایک مُڑی ہوئی ٹہنی پر بکس والا رومال رکھ دیا۔ پھر وہ گھر میں واپس آگئی اور اُسے چیٹک لگی ہوئی تھی کہ

بکس اس پُراسرار طریقے پر کمرے میں آیا کیسے ؟ اور پھر پھر کر خیال اُسی نامعلوم شہزادے کی طرف جاتا تھا۔

چوتھا باب

خالہ مارتھا بیوہ تھی۔ بڑی خوش دل بیوہ۔ ٹھنگنے قد کی موٹی سی عورت اور اُس کی آنکھوں میں بڑی شوخی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پہلے زندگی بھی شوخ گزاری ہو گی۔

شہر کے عقب میں ایک چھوٹا سا گھر تھا اس میں وہ رہتی تھی۔ سامنے ہی تھورنگیا کے جنگل کھڑے جھومتے تھے۔ گھر کے اِرد گرد بھی باغ اور پھل پھلاری تھی۔ اس کی دیکھ بھال نہیں ہوتی تھی۔ لیکن بہار کا موسم تھا۔ نئے نئے پتوں اور پھولوں کی وجہ سے تر و تازگی تھی۔

اِس وقت وہ اپنے باورچی خانے میں تھی اور یہ باورچی خانہ بھی اپنی مالکہ کی خصوصیات کا آئینہ دار تھا۔ کُشادہ اور ہوادار، پکا فرش، صاف سُتھرا، مگر سامان بھوہڑپن سے رکھا تھا۔ ترکاریوں کے چھلکے اور ٹکڑے پڑے نظر آتے تھے۔ کانٹوں میں گوشت کی بجائے صافیاں لٹکی تھیں۔ دُھلے دُھلائے برتنوں کے ڈھیر صندوقوں پہ لگے تھے۔

اُس کے مزاج کی بے پروائی پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتی تھی، طبیعت مہربان اور بڑی اچھی پائی تھی۔ مزاج میں آزادی اور تمسخر، زود اثر اور ضدی۔ اور اس سب کے ساتھ فطرت میں ہمدردی بہت تھی۔ سختیوں اور مصیبتوں کی کہانیاں سُن کر دل فوراً پسیج جاتا تھا، خصوصاً اُن کہانیوں کو سُن کر جن میں کام دیو (کیوپڈ) کی جلوہ فرمائی ہوتی تھی۔

ایک موٹے بھدے سے لڑکے نے، جس کی عمر انھارہ سے کم معلوم ہوتی تھی لوڈیل ڈول مردوں کا سا تھا، دروازہ کھٹکھٹایا اور نظریں نیچی کئے کھڑا رہا۔ مارتھا نے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اندر آجاؤ۔ اندر آجاؤ۔ کارل فشلے۔ جہاں تم کھڑے ہو وہاں سے میں تمہاری آواز نہیں سُن سکتی۔"

وہ کمرے میں بھدے پن سے داخل ہوا۔ کندھے چڑھاتا اور کچھ گھبرایا ہوا۔ مارتھا کی طرف اُس نے اُچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور چہرے پر ایک ایسی مُسکراہٹ تھی جیسے کوئی منہ چڑا رہا ہو۔

مارتھا نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اس پر بیٹھ جاؤ اور جو کچھ تمہیں کہنا ہے کہو۔"

وہ نظریں جھکائے بیٹھا رہا اور اپنے خیالات ظاہر کرنے کیلئے الفاظ کی تلاش میں طرح طرح بڑبڑاتا رہا۔

مارتھا نے اُس کی ہمت افزائی کے لئے کہا۔ "ٹھوک ٹھیک اپنے خیالات۔ دُنیا کی

کوئی چیز تجھے اُس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک تُو اسے خود نہ مانگے ....
اور اُس دُنیا میں بھی۔"

باوجود اِس حوصلہ افزائی کے وہ اب بھی شرمیلے پن سے گونگا بنا رہا۔
بے صبری سے مارتھا بولی "میں جانتی ہوں تجھے کیا کہنا ہے۔ وہی پرانا رونا۔ کوئی لڑکی ہوگی۔ ہے نا؟"

اُس نے تین چار دفعہ زور زور سے سر ہلایا۔
مارتھا نے کہا۔"اور وہ تجھ سے محبّت نہیں کرتی؟"
ہاں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نہیں۔ وہ مجھ سے محبّت نہیں کرتی؟"
اُس نے بڑی مشکل سے گویا سسک کر کہا۔
مارتھا نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔"آہ! میرے پیارے لڑکے، تیری ساری مشکلات کو ختم کرنے کے لئے میرے پاس ایک چیز ہے۔"

یہ کہہ کر وہ لپک کر الماری کے پاس گئی اور اُسے کھول کر اُس میں سے ایک شیشی نکالی۔ اور لا کر اُس کی آنکھوں کے آگے ہلا کر بولی۔"دیکھو یہ رہی۔ اس کے تین قطرے اگر تم پی لوگے تو دُنیا بھر میں جس عورت کو تم چاہو گے وہ تم سے محبّت کرنے لگے گی۔ ابھی پی لو۔ اسی وقت پی جاؤ۔ اس کا دل تمہاری طرف سے نرم ہو جائیگا ... اور تمہارا بھی۔ اس کا میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔"

اِتنا کہہ کر اُس نے ایک پیالے میں تھوڑا سا عرق نکالا اور لڑکے نے بڑے

اشتیاق سے ایک ہی گھونٹ میں اُسے اُتار لیا۔
"میں تجھ سے اسکی کوئی قیمت نہیں لونگی، میرے حسین لڑکے۔ بس صرف ایک بوسہ!"
یہ کہہ کر بڑے عشوہ و انداز سے مارتھا نے اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ لڑکا اُس کی آغوش سے نکلنے کے لئے بھونڈے پن سے تڑپا اور باورچی خانے میں سے نکلکر بے تحاشہ بھاگا اور مارتھا اُسے کھڑی نفرت سے دیکھتی رہی کہ باغ میں سے بگ ٹٹ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ خدا جانے کہاں جا کر دم لیا۔ مارتھا بڑبڑائی :۔
"ہوں! ہوں! آجکل لوگوں کو کیا ہو گیا ہے! میرے لڑکپن کے زمانے میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے"
کھڑکی میں سے ایک شاداب وادی دکھائی دیتی تھی، جس میں اُونچے اُونچے درخت کھڑے جھومتے تھے۔ یہ وادی بڑی حد تک ہموار تھی اور اس میں ڈھلان کم تھا۔ مارتھا نے آٹھ نو بچوں کو اس میں کھیلتے دیکھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان بچوں کے قہقہوں اور خوشی کی چیخوں کی آوازیں اُس کے کان میں آتی تھیں۔ پھر اُس کے دیکھتے دیکھتے اُن سب نے اپنا کھیل ختم کر دیا اور ڈھلان پر سے دوڑتے اور چیختے دکھائی دیئے :۔
"مارگریٹ! مارگریٹ!"
مارگریٹ موڑ پر سے جلدی جلدی آ رہی تھی اور اُس کی بغل میں کوئی چیز دبی تھی۔ بچے دوڑ کر اسکے قریب پہنچ گئے اور سب نے اُسے گھیر کر کہنا شروع کیا :۔

"مارگریٹ۔ آؤ ہمارے ساتھ کھیلو۔ ہم نے ایک نیا کھیل نکالا ہے۔"

"ابھی آتی ہوں ابھی میرے پیارو۔ لیکن پہلے مجھے اپنی خالہ سے کچھ کہنا ہے۔"

وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ دوڑ کر خالہ کے پاس گئی اور اُسے پیار کیا۔ پھر اپنی بغل میں سے بکس والا رومال نکالا اور شرما شرما کر اُسے کھولنے لگی۔ جب کھول چکی تو خوشی خوشی بولی:-

"دیکھو خالہ میری دراز میں سے مجھے کیا ملا!"

اِتنا کہکر اُس نے بکس خالہ کی طرف بڑھایا اور اُسکا کھٹکا دبا دیا۔

اُس کی خالہ نے تعجّب و حیرت سے ٹھٹک کر دیکھا۔ پھر اس میں سے سونے کی زنجیر نکال کر اُس پر رشک سے ہاتھ پھیرا اور مشتبہ نظروں سے مارگریٹ کی طرف دیکھا۔

"اچھا تو میری ننّھی بلی۔ تیرا ابھی کوئی دلدار پیدا ہو گیا!"

"نہیں نہیں خالہ! میں نے ابھی کہا تھا نہ تم سے کہ یہ میری دراز میں رکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اماّں سے بھی ابھی تک کوئی ذکر نہیں کیا کہ کہیں وہ بھی یہ خیال نہ کرلیں کہ میرا کوئی دلبر پیدا ہو گیا ہے۔ اور بھائی ویلنٹین سے بھی نہیں کہا۔ یہ تمہارے لئے نئی خبر ہے خالہ کہ بھائی گھر آئے ہوئے ہیں۔ ہے نا نئی خبر؟"

"ویلنٹین گھر آیا ہوا ہے؟ بڑی عجیب خبر ہے یہ تو!"

"ہاں۔ دیکھو یہ کلائی میں جو چاندی کی زنجیر پڑی ہے وہ میرے لئے لائے ہیں۔"

" بہت بھلی لگتی ہے تیرے ہاتھ میں۔ اچھا اب ذرا سونے کی زنجیر پہن کر دیکھیں۔ پہلے میں خود پہن کر دیکھتی ہوں۔"

خالہ مارتھا آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور زنجیر کو اپنے سینے پر مختلف زاویوں سے رکھکر دیکھا اور ملوکانہ تمکنت سے گردن میں خم ڈال ڈال کر دیکھتی رہی۔ اُدھر مارگریٹ اُس کے پیچھے کھڑی بےچینی سے پہلو بدل رہی تھی کہ خود پہن کر دیکھے۔ خُدا خُدا کر کے خالہ نے زنجیر چھوڑی اور ایک آہِ سرد بھر کر بولی:۔

"لے بچّی۔ اب دیکھ تیرے گلے میں کیسی کھلتی ہے۔"

مارگریٹ نے بڑی پھُرتی سے اُسے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے گلے میں پہن لیا اور سانس روک کر اپنا عکس آئینے میں دیکھا۔

"آہا۔ کیسی خوبصورت، کیسی اچھی معلوم ہوتی ہے۔" مارگریٹ نے ہانپ کر کہا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور خیال اس کے ذہن پر چھا گیا اور وہ یہ تھا کہ اگر شہزادہ اُس کو اِسے پہنے ہوئے دیکھے تو کس قدر خوش ہو۔ مسرّت کی لہر اُس کے سر سے پاؤں تک تڑپتی ہوئی چلی گئی۔ یہ مسرّت جسمی بھی تھی اور ذہنی بھی۔ یہ مسرّت زندگی کی تھی۔ آج کا دن، یہ لمحہ کس قدر مسرّت آفریں تھا۔ اِس انکشاف پر کہ وہ ایک نئی مارگریٹ بن گئی ہے۔ ایک ایسی مارگریٹ جو زندگی کی آواز کا جواب دے سکتی تھی۔ جو زندگی کی آواز پر لرز جاتی تھی۔ جیسی اس لمحے اس کی حالت تھی۔ اس میں ایک پُرزور

جذبہ موجزن تھا کہ وہ اُن تاثرات کو ادا کر سکے جو اُسے کپکپا رہے تھے۔

باہر بچے گا رہے تھے اور اُسے آوازیں دے رہے تھے۔ "مارگریٹ، مارگریٹ"

مارگریٹ بولی۔ "میں آرہی ہوں بچو! ابھی آرہی ہوں" اور لپک کر اُن کی طرف چلی۔ بچوں نے خوشی کی چیخوں سے اُس کا خیر مقدم کیا، اور بن دیویوں کی طرح آنکھیں چمکتی، جسم بہار کی ہوا سے ٹکراتا، سورج اور بادِ خُنک کے بوسوں سے بے خبر وہ بچوں کے ساتھ وادی کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

مارگریٹ کی نئی ہیئت کذائی کو دیکھکر مارتھا حیران ہو رہی تھی اور اس کی کایا پلٹ کا سبب معلوم کرنے کی کوشش میں مُنہمک تھی کہ ایک بھاری اور گہری آواز نے اُسے چونکا دیا۔

اُس نے پلٹ کر دیکھا تو دروازے میں ایک شخص کھڑا نظر آیا، جو خوش اخلاقی سے مُسکرا رہا تھا۔ سر پر ایک سیاہ ٹوپی تھی اور اس میں ایک لمبا سُرخ پَر لہرا رہا تھا۔ یہ شخص کمرے میں داخل ہوا۔ بھاری بھر کم آدمی تھا اور اس کا چُغہ کالے رنگ کا تھا جسکے حاشیئے سُرخ تھے۔ اُسنے کہا:-

"حسین خاتون مجھے معاف کیجئے گا۔ مجھے مسز مارتھا کی تلاش ہے"

اُس کے الفاظ سُنکر مارتھا کا دل اُچھلنے لگا۔ غمزہ سے آنکھیں چڑھا کر بولی:-

"میں ہی ہوں مسز مارتھا۔ گو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں شادی شُدہ ہوں، میرے عزیز شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"تب تو میں نہایت خوش نصیب رہا حسین ترین خاتون مسز مارتھا کیلئے میں ایک تحفہ لایا ہوں۔ تو یہ آپ کے لئے ہی ہے"

اُس نے اپنے چُغہ میں سے سونے کا ایک بھاری سا ہار نکالا جو اشرفیوں کا بنا ہوا تھا۔

"مُبارکی ہی میں جو آپ کے بھائی ہیں یہ اُن کی طرف سے ہے" یہ کہکر اُس نے ہار اس طرح اپنے ہاتھوں میں لیا گویا مارتھا کے گلے میں پہنانا چاہتا ہے۔

اُس نے مایوسی سے نووارد کی طرف دیکھا اور بولی "لیکن میرا تو کوئی ــــ"

وہ کہتے کہتے رُک گئی اور اُسکے ہاتھوں میں سے ہار جھپٹ کر آئینہ کی طرف لپکی تاکہ اُسے اپنے گلے میں پہن کر دیکھے۔ پھر خوشی کی چیخیں مارنے کے بعد بولی:۔

"میں تو سمجھی تھی کہ اتنے سال گزر جانے پر بھلا اُس نے مجھے کیا یاد رکھا ہوگا۔ کیسا اچھا بھائی ہے میرا کہ اپنی ننھی مارتھا کو نہ بھولا۔ لیکن یہ تو میں بھی بھول گئی کہ میں میزبان ہوں۔ تشریف رکھیئے اور میرے ساتھ شراب پیجئے"

نووارد کے چہرے پر خوف کے آثار ظاہر ہوئے۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا:۔

"شراب ؟ میں اُسے چھُونا تک نہیں۔ لیکن اے حسین دوشیزہ اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اپنے پینے کی چیز خود تیار کر لوں"

یہ کہکر وہ الماری کی طرف بڑھا جس میں شراب اور پینے کی اور چیزیں رکھی

تھیں۔ بڑی پھرتی اور احتیاط سے کئی بوتلوں میں سے اُس نے تھوڑا تھوڑا سا عرق پیالے میں نکالا اور پھر اپنا ہاتھ جام پر رکھکر اُسے خوب زور سے جھکولے دیئے اور بولا :-

"میں نے یہ فن پیڈروا میں سیکھا تھا" یہ کہکر پیالہ میز پر رکھدیا۔ وہ چمک رہا تھا اور مارتھا کا جی اُسے دیکھکر للچانے لگا۔ یہاں تک کہ اُسکی طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگی :-

"پیڈروا کی اس عجیب و غریب چیز کو میں پینا چاہتی ہوں"

یہ کہا اور ناز و انداز سے اُسے اُٹھا لیا۔ مہمان نے اُسے باز رکھنے کا بہانہ کیا مگر اُس نے ایک بڑا سا گھونٹ لے لیا۔ ذرا سی دیر بعد اُس نے کھانسنا اور ہانپنا شروع کیا۔ تکلیف سے اُس کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ اُس کے پیٹ میں آگ لگ رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بھڑوں کا چھتہ لپٹ گیا ہے۔ نو وارد اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

پھر مارتھا کی حالت بدلی۔ کھانسی کا دورہ ختم ہوا۔ غصّہ اور ملامت کے آثار چہرے پر سے جاتے رہے اور ان کی بجائے غمزہ و سرخوشی کی علامات نمایاں ہوگئیں۔ اُس نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیر پھیر کر سرد آہیں بھرنی شروع کیں۔ پھر نو وارد کی طرف جُھکی اور کہنے لگی" تمہاری آنکھیں کیسی شریر ہیں"

وہ بولا۔" ہاں ہاں! یہ تو ہی ہی۔ لیکن اب مجھے اپنے دوست کے پاس جانا ہے۔

وہ دیکھو وہ رہا وہ" اور اُس نے خیاباں کی طرف اشارہ کیا۔

مارتھا نے اُس طرف دیکھا تو اُسے ریشمی لباس پہنے ایک شخص نظر آیا جو ایک درخت کا سہارا لئے کھڑا تھا اُسکا ایک ہاتھ سینے پر زور سے بھنچا ہوا تھا اور وہ مارگریٹ کو دیکھنے میں مُنہمک تھا جس کے گرد بچے اُچھل کُود رہے تھے اور گا رہے تھے۔ وہ درخت کے سائے میں اس طرح کھڑا تھا کہ دیکھے جانے والے اُسے نہ دیکھ سکیں۔

"وہ ہے میرا دوست۔ کیوں ہے نا حسین؟ وہ ایک شہزادہ ہے۔ اصل نسل شہزادہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو حسین لڑکی کھڑی ہے اُس پر عاشق ہو گیا ہے۔ اُسے اپنی دُلہن کی تلاش ہے اس لئے ....."

"یہ لڑکی تو میری بھانجی ہے، اور اس سے زیادہ حسین لڑکی ......"

"تمہاری بھانجی ہے؟ تب تو پیاری خاتون تم میرے دوست کی مدد کر سکتی ہو۔ شہزادہ تمہاری بھانجی سے یہاں اس طرح مِل سکتا ہے کہ کوئی اور اُن کی باتوں میں دخل نہ دے۔"

مارتھا کے مُنہ سے صرف اتنا نکلا "شہزادہ! شہزادہ!"

"اِس محبّت میں مجھے صرف تمہاری امداد کی ضرورت ہے۔" نو وارد نے کہا۔

مارتھا اُس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے بولی "ہاں ہاں۔ اور تم بھی تو یہاں آیا کرو گے؟"

"ہاں۔ میں تو آتا ہی رہوں گا۔" اتنا بُڑبُڑا کر اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کمرے میں سے چلنے کو ہوا۔ پیٹھ پھیرتے ہی انتہائی نفرت سے اُس کا مُنہ بگڑ گیا اور وہ گھر سے رُخصت ہوا۔

فاؤسٹ اُچھلنے کُودنے والوں کا تماشہ کھڑا دیکھتا رہا۔ اپنی ساری عظیم الشان زندگی میں اُس نے ایسا متاثر کرنے والا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ طلسماتی شان وشکوہ، عیش ونشاط کی مجلسیں۔ شاہی دربار۔ ماضی کی سیر وتفریح، زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سحر کے زور سے جو سیاحت کی تھی، سارے حسین، حیرت خیز اور پوشیدہ مقامات جو اُس نے دیکھے تھے۔ غرض سب کچھ اس منظر کے آگے ہیچ تھا۔ یہ منظر کیا تھا پرستان کا نظارہ تھا۔ وادی میں سبز گھاس کا فرش تھا، جگہ جگہ پھولوں کی افشاں چُنی ہوئی تھی۔ سفید تنوں والے اُونچے اُونچے درخت پہرہ دے رہے تھے اور بہار کی ہوا چلتی تھی تو مستوں کی طرح جُھومنے لگتے تھے۔ ان کے پیچھے شاہ بلوط کے مضبوط درختوں کی فوج کھڑی تھی اور انکی ٹہنیاں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں گویا دیو ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں کہ خبردار کوئی نااہل اِس پرستان میں داخل نہ ہونے پائے۔

چونچال بچّے پھُولوں کے ہار پہنے اس طرح ہنس رہے تھے جیسے چاندی کی گھنٹیاں بجتی ہوں۔ اِن سب نے ہاتھ جوڑ کر مارگریٹ کو گھیرے میں لے لیا تھا اور گاتے جاتے تھے اور چکّر کاٹتے جاتے تھے۔ یہ گویا پرستان کے باشندے تھے، سیماب وش،

باد پا، کہ ذرا سا اشارہ پاتے ہی درختوں کی ٹہنیوں میں روپوش ہو جائیں۔ مارگریٹ اُن کے بیچ میں سُدھ کھڑی تھی۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور اُن میں سے نُور چھن رہا تھا۔ چہرہ خوشی اور زندگی سے تمتما رہا تھا۔ اس کا لباس ملائم اور سفید تھا جس میں سبزہ جھلک رہا تھا۔ ہوا سے اس کے کپڑے پھڑپھڑا رہے تھے اور اسکے نازک حسین جسم سے پلٹے جا رہے تھے۔ یہ گویا بن دیوی تھی جو درختوں اور پھولوں کی محافظ تھی۔

یہ سب مِل کر گھیرے کا کھیل کھیل رہے تھے جو پھولوں سے کھیلا جاتا تھا اور غالباً اب سے صدیوں پہلے سے بھی یہی کھیل کسی نہ کسی شکل میں اسی وادی میں کھیلا جاتا رہا تھا۔ بچّوں کے گلوں میں پھولوں کے زنجیرے پڑے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں پھولوں کے ڈنٹھل تھے۔ مارگریٹ کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوتے تھے اور ان پر ایک گجرا رکھا تھا تاکہ جب ناچنے والوں کا گھیرا ٹوٹے تو جو دوسرا بادشاہ یا ملکہ بنے اُسے اِس کا تاج پہنا دے۔

فاؤسٹ ٹکٹکی جمائے سانس روکے اِس پرستان کے منظر کو دیکھ رہا تھا تاکہ اس کے سانس سے یہ تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ نہ جائے، اُس کی نظر اب صرف مارگریٹ پر جمی ہوئی تھی۔ زندگی کے جتنے شبہات تھے اب سب فنا ہو چکے تھے۔ اُس کی رُوح اب ایک بار پھر جوان ہو گئی تھی اور اس میں وہ تمام اُمیدیں اور آرزوئیں پیدا ہو گئی تھیں جو شبابِ لطیف کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ مارگریٹ کی معصومیّت اس میں اس طرح کارفرما ہو رہی تھی جیسے کوئی پاک کرنے والا شعلہ

ہو۔ وہ فاؤسٹ جسے صرف عیش و نشاط، عیاشی و اوباشی کی تلاش رہتی تھی فنا ہو رہا تھا اور اس کی بجائے ایک ایسا فاؤسٹ مرتب ہو رہا تھا جس میں اُمید اور معصومیت کی آرزو جاگ رہی تھی۔

بچّوں نے اب گھیرے کا گیت گانا شروع کیا اور اپنے ہاتھوں کو خوب پھیلا کر گھیرا بڑا کیا اور مارگریٹ کے گرد گھومنے لگے۔ اس طرح کہ ان سب کی نظریں اسپر لگی رہیں:-

دولھا کے لئے اِک پھول۔
اِک پھول اِک پھول۔
دولھا کیلئے اِک پھول اور
دُلہن کے لئے اِک گجرا۔

مارگریٹ کے چہرے پر سوچ کے آثار پیدا ہو گئے۔ گویا یہ سیدھے سادے الفاظ اُسے ایک پیغام پہونچا رہے تھے۔ ایک حوصلہ شکن آرزو کے پورا ہونے کی اُمید دلا رہے تھے۔

کھیل کے قاعدے کے مطابق اُس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ یہ گویا گھیرا ٹوٹنے کی تمہید ہوتی تھی، اب بچّوں نے پھر گانا شروع کیا اور دوسری سمت میں چکّر کاٹنا شروع کیا:-

اُوپر ڈھونڈو نیچے ڈھونڈو۔

اس کے سر پر تاج رکھو۔
تاج یہ خوشیاں لائیگا لیکن
بوسہ سے پہلے چھُو تو لو۔

تیز چیخوں کے ساتھ گھیرا ٹوٹ گیا اور سب تتر بتر ہو گئے۔ سب بچے بھاگ کر درختوں کے سایوں میں جا چھپے۔ مارگریٹ ابھی تک اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپائے کھڑی تھی۔ فاؤسٹ بے اختیاری میں آگے بڑھا اور مارگریٹ کے قریب پہونچ گیا۔ آنکھوں میں پرستش کی چمک تھی۔ مارگریٹ کی آنکھیں بند تھیں اور ہاتھوں میں پھولوں کا ہار لئے قہقہہ لگا کر بولی :-

"ٹھہرو تو سہی شیطانو، آئی میں ابھی۔ دیکھنا میں اپنا تاج کسے دیتی ہوں۔"

اُس کے پھیلے ہوتے ہاتھ فاؤسٹ سے ٹکرائے اور اُس نے جلدی سے یہ کہہ کر اُس کا بازو پکڑ لیا کہ "میں نے تجھے پکڑ لیا۔ تو ــــــ"

پھر اس کی یہ حالت ہوئی جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ سر پیچھے کو جھکا ہوا حیرت سے آنکھیں پھٹی ہوئیں اور دفورِ مسرت سے سارے جسم میں تشنّج اُس کی اُنگلیوں نے اُس ہاتھ کو آہستہ سے ٹٹول کر دیکھا تاکہ یقین ہو جائے یہ کوئی فریب نظر یا دل کی گھبراہٹ کا نتیجہ نہ ہو۔ اُس نے مضبوط گرم ہاتھ کو محسوس کیا، اور جب اس کا یقین ہو گیا وہ اُسی بے مثل مرد سے ملی کھڑی ہے جس کے لئے اُس نے اپنی ساری زندگی تج دی ہے اور وہ محبت نذر گذران دی ہے جس کا محرّک وہ خود ہوا تھا تو اُس کے

چہرے پر گلابی رنگ چھا گیا۔ اُس کی اُنگلیاں رُک رُک کر اُس کے بازو سے پھسلیں اور اس کے ہاتھ پر آ کر ٹکیں۔ شرما کر اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا مگر اُس کے رگ وپے میں بجلی سی کوندگئی۔ فاؤسٹ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سر نیچا کر کے اور ایک گھٹنا ٹکا کر ہلکی موثر آواز میں بولا "مجھے اپنا تاج دیدو"۔

صرف ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹکی۔ آہ کی طرح کی ایک آواز اُس کے مُنہ سے کپکپاتی نکلی، اور اُس نے جُھک کر پھولوں کا تاج فاؤسٹ کے سر پر رکھدیا۔ اُس کی آنکھوں میں پورا پورا اعتماد اور انتہائی مسرت تھی۔ فاؤسٹ نے بڑی نرمی سے اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے رُخسار سے لگا لیا۔

اب اُنہیں معلوم ہوا کہ جو نیچال بچے اُنہیں گھیرے ہوئے چہک رہے ہیں۔ اُن سب نے ملکر زور زور سے گانا شروع کیا۔ اور چکر کاٹنے لگے۔ اب اُنھوں نے اس کھیل کے گیت کا آخری بند گایا جس میں نئے بادشاہ یا ملکہ کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

ایک، دو، تین۔

تم آزاد ہو۔

ایک بوسہ اُس کے لئے۔

ایک بوسہ تمہارے لئے۔

آنکھ جھپکاتے میں وہ سیدھا کھڑا ہو چکا تھا اور مارگریٹ اُسکے آغوش میں تھی۔ اُس کی پُر شوق نظریں مارگریٹ کی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں اور اُن میں سے

اعتماد اور معصومیت جھانک رہی تھی اور خود اس کے جذبات کا عکس بھی اُن میں نظر آ رہا تھا۔ تمام خوف، شُبہ، خطرہ، مارگریٹ کے شُعلۂ محبّت سے جل چُکا تھا۔

گرمجوشی مگر نرمی سے فاؤسٹ نے اُس کے لبوں کو چُوما۔ یہ محبّت کا پہلا بوسہ تھا، جو اُس کے لبوں پر ثبت کیا گیا تھا۔ اس لمحہ اُس نے اپنی رُوح فاؤسٹ کے سُپرد کر دی۔

پھر ہانپ کر وہ فاؤسٹ سے علیحدہ ہوئی۔ چہرے پر عجیب روشنی تھی چھوٹتے ہی وہ وادی میں سے چھلانگیں مارتی درختوں کے سائے میں روپوش ہو گئی۔ بچّے بھی مُنتشر ہو کر خوشی سے چیخنے لگے گویا جو کچھ ہوا تھا وہ بھی اس کھیل کا ایک جُزو ہی تھا۔

فاؤسٹ بھی اُس کے پیچھے لپکا۔ درختوں کے بیچ میں سے اُس کے سفید لباس کی جھلکیاں دکھائی دے رہی تھیں اور وہ اُڑی چلی جا رہی تھی، بالآخر درختوں کے ایک گھنے جُھنڈ کے قریب فاؤسٹ نے اُسے جا لیا۔ تیز دوڑنے کی وجہ سے اسکا سانس پھُول گیا تھا۔ ہانپتے ہوئے اُس نے التجا کی۔ مارگریٹ، مارگریٹ! تُو مجھ سے کیوں بھاگ رہی ہے؟ تیری ہی تلاش میں تو میری ساری زندگی گزُری ہے اور اب جبکہ میں نے تجھے پا لیا ہے تُو مجھ سے گریزاں ہے۔ ٹھہر مارگریٹ!"

محبّت کی سرخوشی نے اس کے چہرے کو نورانی بنا دیا۔ اُس کے ہاتھ خود بخود فاؤسٹ کی طرف پھیل گئے، رخساروں پر آنسو ڈھلکنے لگے اور لبوں پر لفظ آتے آتے آہیں بن گئے۔ فاؤسٹ نے اُسے سینے سے لگا لیا اور ایک گرم و طویل بوسہ لبوں پر

ثبت کیا۔

آہستہ سے بولا۔"تو میرے لئے مقدّس ہے۔ میں تجھ سے محبّت کرتا ہوں مارگریٹ۔"

پھولوں کا ہار فاؤسٹ کے ہاتھ میں اب تک تھا۔ اُسے مارگریٹ کے سر پر آراستہ کرکے بولا۔"دیکھو۔ میں تمہیں یہ تاج پہنا کر اپنی ملکہ بناتا ہوں۔"

اور مارگریٹ نے آہستہ سے کہا۔"اور تم میرے بادشاہ ہوگئے۔ میں ــــ میں تم سے محبّت کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اپنے لرزتے ہاتھوں سے فاؤسٹ کا سر جھکایا اور اپنے سینے پر رکھکر بڑی نرمی سے اُسے پیار کیا۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر مسکراہٹ۔

فاؤسٹ نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔"اور میں تجھ سے محبّت کرتا ہوں، دل و جان سے محبّت کرتا ہوں۔ تو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتی کہ تو میرے لئے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ تو میرے لئے اُمید لائی ہے اور ایک نئی زندگی کا پیغام۔ میں تیرا ہوں پیاری۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تیرا۔"

پانچواں باب

رات کا وقت تھا اور دُور سے روڈا کا شہر اس طرح چمک رہا تھا گویا کوئی کھلونا ہے جس میں روشنی ہو رہی ہے۔ بازار میں بھیڑ بالکل نہیں تھی لیکن بازاروں میں سے گزرنے والے راہگیروں کو سراؤں اور شراب خانوں میں سے گانے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔

مارگریٹ کے گھر کے قرب وجوار میں سناٹا تھا۔ اس کے کمرۂ خواب میں ایک مدّھم روشنی نظر آرہی تھی جو کھڑکی میں سے نکل کر تاریکی کو چیرتی ہوئی سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ شہر سے تھوڑے فاصلے پر سڑک کی دوسری طرف اندھیرے میں فاؤسٹ کھڑا تھا۔ اُنگلیوں میں اُنگلیاں پھنسی ہوئی تھیں اور پُر اشتیاق نگاہوں سے کھڑکی کی طرف تک رہا تھا اور اس سایہ کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا جو کھڑکی کے باریک پردے پر متحرک نظر آرہا تھا۔

اسی سوچ میں وہ ڈوبا ہوا تھا کہ میفسٹو کی آواز اس کے کندھے کے قریب سے سُنائی دی اور اس آواز نے اُس کے خیالات کو درہم برہم کر دیا۔ فاؤسٹ کو اس

کی آواز ایک ناگوار جھنکار معلوم ہوئی۔

"تو اب کس بات سے ڈر رہا ہے فاؤسٹ؟ وہ چھوکری خود تجھے روشنی سے آنے کی راہ دکھا رہی ہے۔"

فاؤسٹ نے غصّے سے کہا۔"ملعون خاموش رہ۔ یہ نورانی لڑکی اسقدر پاکیزہ ہے کہ تیرے خیالات ہی اس کو ملوّث کر دینگے۔ مارگریٹ کو تو کوئی نقصان نہ پہونچا سکے گا۔"
میفسٹو ہنسا مگر اُس کے ہنسنے میں خوشی کو دخل نہ تھا اور فاؤسٹ کو تیکھی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔"میں اس چھوکری کو نقصان نہیں پہونچاؤں گا۔ وہ تیرے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن تو بڑا سست چاہنے والا ہے فاؤسٹ، تو تو بہت جلد باز اور ـــــ دل پھینک تھا۔ تین دن سے تو اس چھوکری کو جانتا ہے۔ اُس کی خالہ کے ہاں اُس سے اظہارِ محبت کر چکا ہے اور اب بھی تکے ہی جاتا ہے۔"

فاؤسٹ نے غصّہ سے پلٹ کر کہا۔"مارگریٹ میرے لئے مقدس ہے۔ اس کی معصومیت حصولِ سکون کا ذریعہ ہے۔ اپنی بدگوئی کو ختم کر۔ مارگریٹ میری دُلہن بنے گی۔"

"اوہو! اچھا! کیا تو گرجا میں داخل ہو سکتا ہے؟ جب پادری تیرے آگے صلیب لائے گا تو کیا تو اُس کی تاب لا سکے گا؟ کیا جتنی وہ قسمیں دے گا اور جتنی بھی مقدس بک بک وہ کرے گا اُس کے آگے سرِ تسلیم خم کر سکے گا اور اسکی دُعائیں قبول کر سکیگا؟ تو کچھ نہیں کر سکتا اور معلوم بھی ہے کہ کب سے نہیں کر سکتا؟"

فاؤسٹ نے شکستہ خاطری سے کہا" او میفسٹو تو نے کس بُری طرح مجھے اپنے جال میں پھانسا ہے! تیرے سارے تحفے اور عطیے میرے لئے عذاب بن گئے۔ تیرا دیا ہوا جوانی کا تحفہ! ملعون جوانی!" فاؤسٹ کے یہ الفاظ درد و کرب کی چیخیں معلوم ہوتے تھے۔ اُس نے ایک گہری سرد آہ بھری اور اس میں نا اُمیدی و نامُرادی اور روحانی صعب تھا۔

" لیکن میں اپنی مارگریٹ سے پھر ملونگا۔ میں اُسکے حیات بخش چہرے کو ایک دفعہ پھر دیکھونگا۔ شاید آخری بار میں اُسے دیکھوں گا۔ ضرور دیکھوں گا"

میفسٹو نے طنز سے تعظیماً جُھک کر کہا" جیسی رائے عالی ہو۔ اور اس اثنا میں میں اُس کے بھائی کو لگائے رہونگا" یہ کہکر وہ رُخصت ہوا۔

فاؤسٹ آہستہ آہستہ سڑک پر سے گزرا اور اُس کی کھڑکی کو دیکھتا گیا۔ وہ سرد آہیں بھر رہا تھا اور ہاتھ مل رہا تھا، نا اُمیدی و مایوسی سے بھی اور آرزو و پرستش سے بھی۔

مارگریٹ کا سایہ پھر نظر آیا اور اب کے ذرا زیادہ واضح تھا۔ پھر پردہ ہٹایا اور مارگریٹ نے جھانک کر باہر دیکھا۔ اُس نے لمبے لمبے سانس لئے اور ستاروں کی طرف خوابناک آنکھوں سے دیکھا۔

تھوڑے سے تذبذب کے بعد فاؤسٹ چڑھ کر کنگنی پر پہونچ گیا۔ اُس نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا۔ مدھم روشنی میں وہ فرشتہ کی طرح کھڑی تھی اور فاؤسٹ

دل ہی دل میں اُس کی پرستش کر رہا تھا۔ مارگریٹ نے خوشی کا ایک لمبا سانس لیا اور پھر کھڑکی بند کرنے کو ہوئی۔

پھر ایک ہاتھ روشنی میں نمودار ہوا اور محبت سے اس کے ہاتھ پر رکھا گیا۔ اور اس نے اپنے محبوب کی ہلکی موثر آواز سُنی جس میں شیریں الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ تاریکی میں سے یکایک ہاتھ کے نکل آنے سے وہ ڈری نہیں کیونکہ اسکے خیالات کے سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہاتھ بھی بن گیا۔ وہ اپنے عاشق کے خیال میں غرق تھی اور آنکھیں بند کئے وادی کا منظر دوبارہ دیکھ رہی تھی اور یہ منظر وہ تھا جب وہ اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگی تھی اور اُس کے عاشق نے اُسے پکڑ لیا تھا۔ اور اس کے بعد خالہ مارتھا کے باغ میں جو ملاقاتیں ہوئی تھیں اُن کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ جب اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو نظر اپنے ہی ہاتھ پر پڑی اور اُس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اس ہاتھ کو اپنے محبوب کی خاطر چوم لے۔ اُس نے کہا تھا۔ "پیارے ہاتھ۔ خوبصورت ہاتھ!" چند گھنٹے پہلے اُس نے اِسے چوم کر یہ الفاظ کہے تھے۔ "وہ ہاتھ جو مایوسی کے تاریک سائے میں سے مجھے نکال کر اُمید کی روشنی میں لایا ہے"۔ اس کے بعد ایک سچ مچ کا ہاتھ، خود اس کے محبوب کا ہاتھ اُس کے ہاتھ کو محبت سے تھامے ہوا تھا اور وہ اُس کی پُرشوق آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی تھی۔

فاؤسٹ نے کہا "میری پیاری، تیری آنکھوں کی برکت حاصل کرنے کے لئے میں نے کیسی کیسی آرزو کی ہے!"

اُس نے مارگریٹ کی اُنگلیوں کو چُوما۔

سینے پر ایک ہاتھ رکھے مارگریٹ نے آہستہ سے کہا" آہ، فاؤسٹ! پیارے فاؤسٹ! میرا دل تمہاری طرف کیسا کھنچ رہا ہے! تم بولتے ہو تو جواب میں میرا دل گاتا ہے تم اس پر سانس لیتے ہو تو یہ دھکنے لگتا ہے۔ تم پیار کرتے ہو یہ پگھل جاتا ہے اور میں نیم جان ہو جاتی ہوں۔ تم میرے دل کو اپنے ہاتھوں سے گرما دیتے ہو۔ یہ اب ہمیشہ تمہارے قبضے میں رہے گا۔"

فاؤسٹ نے اُس کی ہتھیلی کو چُوما اور سچّے دل سے بولا۔" اور اس ننھے سے ہاتھ میں فاؤسٹ کی جان ہے۔"

ایک چھوٹا سا سانس لیکر اُس نے اپنا ہاتھ بادلِ ناخواستہ کھینچ لیا اور فاؤسٹ کو خواب آلود آنکھوں سے دیکھا۔ مارگریٹ کا چہرہ زرد تھا اور سینے میں جذبات کا تلاطم تھا۔ اُس نے ملاُمت سے کھڑکی بھیڑنی شروع کی اور آہ بھر کر بولی" شب بخیر پیارے، خدا حافظ۔" اور اُس کے کپکپاتے ہاتھ سے استدعا ٹپک رہی تھی کہ وہ اب چلا جائے۔

پھر فاؤسٹ کے دل میں یہ خوفناک خیال آیا کہ آیندہ وہ اپنی محبوبہ کو کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ چند لمحوں بعد جب یہ کھڑکی بند ہو جائے گی تو ساری روشنی اور نوزائیدہ اُمیدیں اُس کی رُوح میں مُرجھا جائینگی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غارت ہو جائینگی۔ اپنی محبوبہ کی آواز اسے ایک بار پھر سُننی تھی اور آخری دفعہ اُسے بوسہ دینا تھا تاکہ ابدی محبّت کی مُہر اُس کے لبوں پر لگ جائے۔

"مارگریٹ! مارگریٹ! ٹھہرو مارگریٹ!"

فاؤسٹ نے اس طرح یہ الفاظ کہے کہ اُس کی ماں کے کانوں تک اِن کی آواز نہ پہونچنے پائے۔ کھڑکی سے لگ کر اس طرح التجا کی اور بڑی آہستگی سے کھڑکی کو دھکیلا۔ اس کے اور مارگریٹ کے ہاتھوں کے درمیان صرف شیشہ حائل تھا۔ اس کے دباؤ سے کھڑکی آہستہ آہستہ کھلنے لگی اور پھر ایک دم سے کُھل گئی۔

فاؤسٹ نے پُرجذبہ آواز میں کہا۔ "مارگریٹ جانے سے پہلے صرف ایک بوسہ!"

مارگریٹ نے اپنا ہاتھ اس طرح پھیلایا گویا وہ اُسکو منع کرنا چاہتی تھی۔ فاؤسٹ کی استدعا دل میں اُتر جانے والی تھی، چہرے پر التجا، آنکھوں میں جذبات کی چمک تھی۔ اُس نے مارگریٹ کا ہاتھ پکڑلیا اور اُسے اپنی طرف کھینچا۔

فاؤسٹ کی التجا ہزار زبانوں سے طالب رحم تھی۔ مارگریٹ میں انکار کی طاقت نہ رہی۔ وہ فاؤسٹ کے آغوش میں جذب ہوگئی۔ آنکھیں بند، سانس رُکا ہوا، خوشی سے نیم غشی کی حالت تھی۔

فاؤسٹ بولا "خدا حافظ پیاری۔ اللہ تجھے معصوم اور تیرے دامن کو پاک رکھے"۔

وہ اُسے اپنے سینے سے لگائے رہا اور پیار کیا۔ اور اس ایک بوسے میں محبت، مایوسی اور پرستش سب ہی کچھ تھا۔ مارگریٹ بے اختیاری میں اُس سے چمٹی ہوئی تھی۔ اب اُس کی گرفت ہلکی پڑتی گئی یہاں تک کہ فاؤسٹ کے بازوؤں میں بیدم سی ہو کر

پڑ گئی۔ چہرہ زرد اور بے جان معلوم ہوتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس آخری بوسے میں اُس نے اپنی ساری زندگی دیدی تھی، پھر اس پر بیہوشی چھا گئی تھی۔

فاوسٹ اس کی اس حالت سے گھبرا سا گیا۔ کھڑکی میں سے کمرے میں داخل ہو کر وہ اُسے اُٹھا کر اس کے معصوم بچھونے کی طرف لے چلا اور اُس پر لٹا دیا۔ جلدی سے پانی لایا اور اُس کی پیشانی پر چھینٹا دیا۔ سر اور ماتھے پر ہاتھ پھیر پھیر کر طرح طرح کی باتیں کہنے لگا اور اس کی رُوح میں ایک طرح کی ویرانی سی چھائی جاتی تھی۔

ذرا جان میں جان آئی۔ مارگریٹ کے پپوٹے تھرتھرائے۔ لب ہلے۔ زرد چہرے پر سُرخی کی جھلک دکھائی دی۔ فاوسٹ کے دل پر جو بوجھ تھا کم ہو گیا۔ مارگریٹ نے آنکھیں کھول دیں اور اُس کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا دئے۔

گھر کے باہر میفسٹو کھڑا کھڑکی کی طرف خوش ہو ہو کر تک رہا تھا۔

فضا بالکل خاموش تھی اور اس میں صرف اُن خوابناک آوازوں کی دھیمی بھن بھناہٹ سُنائی دے رہی تھی جو کمرے کی کھڑکی میں سے آرہی تھی۔

اس کے بعد کھڑکی بند ہو گئی اور پردہ کھنچ گیا، اور وہ ہلکی روشنی بھی جو سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھی یکایک معدوم ہو گئی۔

میفسٹو بھی بیکار نہیں رہتا تھا اور فاوسٹ سے جُدا ہونے کے وقت سے اب تک تو بہت مصروف رہا تھا۔ شہر کے وسط میں اوائرنج کا شراب خانہ تھا۔ اُس نے اس شراب اور موسیقی کے مرکز کا رُخ کیا۔ وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے

کوئی دھاڑی شرابی جھوم کر چلے اور آپ ہی آپ کہتا جا رہا تھا:-
"بس ایک کڑی اور رہ گئی ہے۔ پھر وہ زنجیر پوری ہو جائیگی جو اُس کی رُوح کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریکی سے جکڑ دے گی" پھر نہایت نفرت و حقارت سے کہنے لگا "پھر تو فرشتہ اعظم میکائیل بھی اس زنجیر کو اپنی آتشیں تلوار سے نہ کاٹ سکے گا۔ اس کے بعد اُسے اس شہر سے نکال لے جانا ہے اور اس ملعون چھوکری سے علیحدہ کرنا ہے۔ فاؤسٹ میں جو نیکی کا عنصر ہے وہ کُچلا جا چُکا ہو گا۔ اس طرح میں نُور کی قوتوں سے اپنی شرط جیت جاؤں گا"
اوائرنخ کا شراب خانہ دُور دُور مشہور تھا اور لوگ جوق در جوق وہاں آتے تھے۔ وہ مسافر جو عمدہ شراب، اگندے اور فحش گیت پسند کرتے تھے اور جنہیں لڑنا جھگڑنا اور مار پیٹ ناپسند نہیں ہوتی تھی وہ شہر سے رُخصت ہونے سے پہلے اس شراب خانے میں ضرور آتے تھے۔ طالب علم بھی یہاں آتے تھے، اور فوجی اور گالی گلوچ کے عادی کام پیشہ لوگ یہاں جمع ہوتے تھے، اور شراب خوری کی مقدار کے لحاظ سے ایک دوسرے کو سند دیتے تھے۔ یہ شراب خانہ دراصل ایک اُونچی چھت کا تہ خانہ تھا اور دیواروں کے سہارے سہارے شراب کے اُونچے اُونچے پیپے رکھے تھے اُن میں سے بعض تو بارہ بارہ فٹ اُونچے تھے۔ خالی پیپے میزوں کا کام دیتے تھے اور بھدّے اسٹول یا بے ڈول لکڑی کی نشستیں بیٹھنے کے کام آتی تھیں۔ گویہاں کے اکثر آنے والے اِسے زیادہ پسند کرتے تھے کہ

پیپوں سے کمر لگا کر زمین پر دراز ہو جائیں اور پاؤں ان سٹولوں یا کرسیوں پر رکھ لیں۔ اسی حالت میں گھٹنوں پر کہنیاں ٹیکائے یہ لوگ رائے زنی کرتے تھے، اور بحثیں کرتے تھے فلسفے پر، سیاسیات پر، مذہبیات اور دنیا بھر کے علوم و فنون پر، یا پھر مسافروں کو قصّے کہانیاں سنایا کرتے تھے، اپنے عشق و محبّت کے معرکے بیان کرتے، آوازے کستے، فحش مذاق کرتے یا بدگوئی میں لگے رہتے کبھی کبھی ان میں سے کوئی گانے لگتا۔ اور باقی سب بھی خواہ مخواہ اِسے پسند کرتے اور سب کے سب ملکر اسکی ٹیپ اُٹھاتے تو گویا قیامت کا شور مچ جاتا جو دُور دُور تک گونجتا سُنائی دیتا۔

میفسٹو یہاں عین اُس وقت داخل ہوا جب ایک طالب علم پیپے پر کھڑا اپنا فضول گیت ختم کر رہا تھا۔ یہ گویا اپنے ہی ساتھیوں میں سے ایک پر طعن تھا۔ میفسٹو کے کان میں اسکے آخری الفاظ پڑے :-

"نصف شب کو آہستہ سے کنڈی کھول۔
تیرا عاشق جاگ رہا ہے کنڈی کھول۔
صبح ہوتے آہستہ سے کرلے بند!"

گیت ختم ہوا تو قہقہوں کا شور بپا ہوا۔ ایک دیوزاد فوجی نے ٹھٹھا مار کر کہا :-

"ہا ہا۔ ہا۔ خوب ہاتھ مارا۔ خوب ہاتھ مارا فروش! یہ نتیجہ یہ ہوا سیبل۔ اچھا تو یہ تو تھا سیبل کہ رات بھر باہر باغ میں کھڑا رہا، اور وہ بڈھا ڈرھیل اندر اُس کے ساتھ

مزے اُڑاتا رہا۔ اور پھر تیرے ہی پیسے سے۔ ہو! ہو! ہو!"

سیبل ایک مرجھوڑا سا طالب علم تھا۔ غمناک چہرے میں عاشقانہ طبیعت پوشیدہ رکھتا تھا۔ فوجی سے کہنے لگا "آہ ویلنٹین! بعض پیدا ہی دولتمند اسلئے ہوتے ہیں کہ اُن سے دولت چھین لی جاتی ہے۔ لیکن خدا اِن سب عورتوں کو غارت کرے۔ مردوں کیلئے یہ ایک عذاب ہیں۔ علاوہ تمہاری خوبصورت بہن مارگریٹ کے۔"

اتنے میں گانے کی ایک گرجدار آواز سُنائی دی۔ یہ کیسی سلیقے سے گانے والے کی آواز تھی۔ گہری اور مُتاثر کرنے والی۔ چھت سے ٹکرا کر یہ آواز گونجنے لگی اور خالی پیپوں میں اِس کا ارتعاش ہونے لگا۔ سب نے پلٹ کر گانے والے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک زبردست ہاتھ پاؤں کا مرد تھا۔ جسم پر ایک لمبا سیاہ چُغہ تھا۔ اور سر پر سیاہ ٹوپی میں ایک لمبا سُرخ پَر لہرا رہا تھا۔ شراب کے سب سے اُونچے پیپے پر کھڑا تھا اور اُس کا پَر چھت سے ٹکرا رہا تھا۔ یہ ایک مذاقیہ گیت گا رہا تھا اور جب کوئی بند ختم ہوتا تھا تو سارے مجمع کے قہقہے سُنائی دیتے تھے۔ یہ ایک بیانیہ گیت تھا جس میں ایک مضحکہ خیز مکھّی کی کہانی سُنائی گئی تھی کہ اِس مکھّی پر کوئی بادشاہ مہربان ہوگیا اور وہ شاہی لباس زیبِ تن کرکے دربار میں جایا کرتی تھی۔ اور پھر اِس مکھّی کے وہ کارنامے بیان کئے گئے تھے جو شاہی بیگمات کے ساتھ اُسے پیش آئے تھے۔ جب اُس کی ٹیپ آئی تو سب نے مِل کر بڑی خوش دلی سے اُسے اُٹھایا:۔

"اور جب وہ ہم کو کاٹتی ہیں۔
ہم اُنکو اُڑاتے، مارتے ہیں۔"

گیت ختم ہوا اور ابھی اُس کی گونج باقی تھی کہ تحسین و آفریں کے نعروں کا ایک طوفان برپا ہو گیا اور سارا شراب خانہ گونج اُٹھا۔

گانے والے نے اُسی بلندی پر سے جھک کر نیچے دیکھا اور اس کے ہاتھ میں جو شراب کا پیالہ تھا بڑھا کر بولا "کاش ایسی مکھی روڈا میں کبھی نہ آئے ورنہ جو لڑکیاں میں نے اِس شہر میں دیکھی ہیں ان کیلئے غم کرنیکا زمانہ آجائے گا۔"

اِتنا کہہ کر وہ چُپکا ہوا اور جس طرح کوئی کسی کا جامِ صحت پیتا ہو اپنا پیالہ اُٹھا کر بولا "روڈا کی سب سے حسین لڑکی کیلئے۔"

سب نے ملکر خوشی خوشی جامِ صحت نوش کیا اور سیبل نے ویلنٹین سے کہا۔

"لو یہ تو تمہاری بہن مارگریٹ ہی ہوئی۔"

اور بہت سی آوازوں نے اس رائے پر صاد کیا۔ "ہاں۔ یہ تو ہے ہی۔"

پھر ایک شور اُٹھا۔ "مارگریٹ کا جامِ صحت۔ مارگریٹ کا جامِ صحت۔"

گانے والے نے وہیں سے چیخ کر کہا۔ "تو مارگریٹ کا جامِ صحت۔ اور ان سب لڑکیوں کا جامِ صحت میں پیتا ہوں جو عُشّاق کو قبول کرتی ہیں کیونکہ نیکی اور حُسن کا میل مُشکل ہے۔ مارگریٹ اور اس کے سب عزیزوں کا جامِ صحت۔"

تھوڑی دیر تک ویلنٹین کی موٹی عقل میں اِس بولنے والے کا مقصد نہ آیا۔

پھر غصہ کی خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ اُس نے اپنے قریب والوں کو اس طرح ہٹا دیا گویا وہ سب بچے تھے اور اپنی لمبی تلوار سُونت کر اُس شخص کی طرف جھپٹا جس نے اِس بے رحمی سے اس کی عزیز بہن کی معصومیت پر حملہ کیا تھا۔ اُچھل کر وہ چند اُونچے پیپوں پر پہونچا اور وہاں سے اُوپر چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہوا۔ تلوار تُلی ہوئی تھی کہ اُچھلتے ہی بھرپور ہاتھ بھی پڑ جائے۔ للکار کر بولا "شیطان!"
"شیطان؟ یہ تو مجھے کہتا ہے۔ اور میں تجھے کہتا ہوں۔ بیوقوف، میں نے تو سچّی بات کہی تھی۔ جلدی کر بیوقوف —— کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کا عاشق کرے میں سے سٹک جائے۔"

اِتنا کہہ کر میفسٹو کرخت آواز کی ہنسی ہنسا جس میں خوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔

ویلنٹین دبکا، وزن تولا اور اُس کے زبردست مضبوط جسم کی مچھلیاں اُبھری ہوئی ایسی معلوم ہوتیں تھیں کہ جیسے کوئی پتھر کا عظیم الشان مجسّمہ کھڑا ہو۔ چہرے کے پٹھے کھنچے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھیں بھنچکر چھوٹی ہوگئی تھیں اور مُنہ سے خونخواری ہُویدا تھی۔ اُس نے چھلانگ لگائی۔ تلوار آگے چمکی اور بایاں ہاتھ پیچھے اُڑا۔

میفسٹو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"ایک اور اُچھلنے والی مکھّی۔ بے ڈنک کی مکھی۔ خُون کی پیاسی مکھی، اے یہ رہا خُون تیرے لئے۔"

ویلنٹین ابھی ہوا میں معلّق ہی تھا کہ میفسٹو نے اس پر اپنا پیالہ اُلٹ دیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ویلنٹین گویا کسی ربڑ کی دیوار سے ٹکرایا جو اُس کے اور اُس کے حریف کے درمیان حائل تھی۔ اس کے سر نے اس طرح جھٹکا کھایا جیسے کسی نے اُس پر ضرب لگائی ہو اور اس کی تلوار اور ہاتھ پاؤں اس نظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکرا کر پھیل گئے۔ پھر سُرخ شراب اُس پر گری اور فوراً ہی ایک شعلے نے اُسے ملفوف کر لیا اور اس کی لپیٹ چھت تک پہونچ رہی تھی۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور ایک چٹاخہ ایسا سُنائی دیا کہ ان کے کان بھی کچھ دیر کے لئے گُنگ ہو گئے۔

ویلنٹین اس طرح گرا جیسے مٹر کا دانہ دیوار سے ٹکرا کر اُچٹتا ہے۔ تھوڑی دیر تک سب حواس باختہ رہے۔ گرے ہوئے فوجی کے گرد ڈرے ہوئے لوگوں کی بھیڑ لگنی شروع ہوئی۔ اتنے میں ویلنٹین اُٹھ بیٹھا اور چاروں طرف تعجّب سے دیکھنے لگا۔ اُس کی نظروں کے سامنے وہ اُونچا سا پیپا تھا۔ زور سے چیختا ہوا وہ اچھل کر اُٹھا لیکن اُس کے غصّے کا شکار غائب ہو چکا تھا۔

مارگریٹ کے کمرۂ خواب کی روشنی گل ہو جانے کے بہت دیر بعد تک میفسٹو اُس کی کھڑکی کو کھڑا تکتا رہا۔ بازار کے دوسرے سرے پر اُس نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سُنی۔ باغ میں سے گزرتا ہوا وہ دوڑ کر گھر کی پُشت پر آیا۔ نیچے کے کمرے میں ماں سوتی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ کھڑکی کے دواسے پر رکھے۔ پھر آگے جھک کر

اُس نے بڑے زور سے پھونک ماری۔

کھڑکی کے پٹ زور سے کھلے اور کمرے میں آندھی کا فرّاٹا گونجنے لگا۔ اُس نے پھر ایک پھونک ماری۔ پردہ پھٹ کر نیچے گر گیا اور پلنگ کے پردے پھٹ پھٹ کر لٹک گئے۔ بڑھیا ماں گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور گرتی پڑتی کھڑکی کے قریب پہونچی کہ ایکا ایکی جو آندھی اُٹھی ہے اُسے کھڑکی بند کر کے کمرے میں گھسنے سے روکے، لیکن جونہی وہ کھڑکی کے سامنے پہونچی ایک اور جھونکا کمرے میں گھسا اور دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ پلٹ کر دروازے کی طرف دوڑی تاکہ اُسے بند کرے مگر کھلے ہوئے دروازے میں سے وہ اس طرح اُڑی چلی گئی جیسے کوئی کاغذ کا پُرزہ۔

برآمدے میں آندھی کا زور ذرا کم تھا۔ یہاں ذراسی دیر کھڑی ہانپتی رہی پھر کپکپاتے ہاتھوں سے چقماق ڈھونڈا اور تیل میں بھیگی ہوئی چھوٹی سی مشعل روشن کی۔ اسے ہوا سے بچاتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھی تاکہ بیٹی کے کمرے میں پہونچے۔ دروازے پر کھٹکا ٹٹولا اور جلدی سے اُسے گھما کر کمرے میں داخل ہوئی اور اطمینان کا سانس لیا۔

تھوڑی دیر تک وہ مارگریٹ کے پلنگ کی طرف حیرت و پریشانی سے دیکھتی رہی۔ سامنے مارگریٹ کا زرد اور رحم طلب چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ اُٹھی بیٹھی تھی اور اس کے قریب ایک نوجوان لیٹا ہوا تھا۔ پھر بڑھیا کے ہاتھ سے مشعل چھوٹ گئی، رونے کی ایک گھٹی ہوئی چیخ سُنائی دی اور اس کے بعد رونے کی طویل سُبکی۔ یہ ایسی آواز

تھی جیسے کسی کی رُوح رو رہی ہو۔ کوئی تباہ و برباد ہوگیا ہو، اُجڑ گیا ہو۔ وہ لڑکھڑا کر واپس چلی، گری اور اُس کا سر برآمدے کی دیوار سے ٹکرایا۔

مارگریٹ نے ایک چیخ ماری اور جلدی سے اپنی ماں کے قریب پہونچکر اُس کا سر اُٹھایا۔ فاوسٹ کمرے کے بیچ میں کھڑا تھا اور اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ چشمِ زدن میں وہ فردوس کی نغمہ زا بلندیوں سے جہنم کی انتہاہ گہرائیوں میں میں پھینک دیا گیا تھا۔ اُس کے کان میں ایک تحکم آمیز آواز آئی :۔

"بھاگ بھاگ فاوسٹ۔ جلدی بھاگ۔ تیری محبوبہ مارگریٹ کے لئے خطرہ ہے۔ اس کا بھائی نیچے آ پہونچا ہے۔ بھاگ"

فاوسٹ ایک لمحہ کے لئے مذبذب ہوا۔ پھر برآمدے میں سے ہوتا ہوا بھاگا اور سیڑھیوں پر سے اُتر کر باغیچہ میں آیا۔ ٹوپی غائب تھی اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اُس نے ایک بھیانک للکار سُنی اور پلٹ کر جو دیکھا تو سامنے کے موڑ پر سے ایک خوفناک دیوزاد انسان اس پر جھپٹتا ہوا نظر آیا۔ یہ ویلنٹین تھا جو تلوار سُونتے اُس کی طرف لپک رہا تھا۔ چہرے پر صرف ایک جذبہ تھا اور یہ جذبہ تھا قتل کا۔ فاوسٹ نے پھرتی سے اپنی تلوار کھینچی اور بمشکل تمام اُس کے پہلے وار کو روکا۔ اور بولا۔

"ٹھہرو۔ میں تم سے نہیں لڑونگا۔ تم مجھے زخمی نہیں کر سکتے اور میں تمہیں نقصان نہیں پہونچاؤنگا"

"اے چوہے .... مجھے نقصان پہونچائے گا اب یہ رہا زہر تیرے لئے"
بیل کی طرح ڈکار کر ویلنٹین نے کہا اور بھونکنے کا ایک زبردست ہاتھ دیا۔
فاؤسٹ اسے پھر بچا گیا۔ لیکن اس میں اسقدر شدت تھی کہ اُسے پیچھے ہٹنا پڑا۔
ویلنٹین کی تلوار اس کے دل کے آس پاس تڑپ رہی تھی، فاؤسٹ کلائی کی ہوشیار
جنبشوں سے اپنی تلوار سے اس طرح بچاؤ کر رہا تھا کہ ویلنٹین کی تلوار کبھی تو
اُس کے سر کے قریب سے اور کبھی ران کے قریب سے بال بال بچ جاتی تھی۔ لیکن
ویلنٹین کی بھاری ضربیں روکتے روکتے وہ تھک چلا تھا۔ ویلنٹین کی ہر ضرب
روکرنے کے بعد فاؤسٹ کے لئے موقع ہوتا تھا کہ اپنے حریف کے کوئی مہلک زخم
لگائے مگر اس کا اُس نے ارادہ ہی نہیں کیا۔ یکایک ویلنٹین پیچھے کی طرف اُچھلا
اور پھر ایک دم سے آگے چھلانگ لگا کر آیا اور زمین پر اس طرح گرا جیسے کسی کا پاؤں
پھسل جائے۔ سیدھا پاؤں آگے کو پھیلا ہوا تھا، گھٹنا خمیدہ تھا۔ بایاں
پاؤں پیچھے کو سیدھا پھیلا ہوا تھا اور بایاں ہاتھ زمین پر ٹکا ہوا تھا۔ اِس
حرکت کے ساتھ ہی فاؤسٹ کے گلے کی طرف تلوار کا وار کیا۔ یہ پینترا ایسا
تھا کہ جو شاذو نادر ہی کسی کو آتا تھا۔ ویلنٹین نے ایک ہسپانوی تلوار باز سے یہ
داؤ سیکھا تھا۔ اس میں درمیانی فاصلہ بہت کم رہ جاتا تھا اور اس کا توڑ صرف
اسی وقت ممکن تھا جب حریف پہلے ہی سے اس کے لئے تیار ہو۔ فاؤسٹ نے بڑی
پھرتی سے پیچھے اُچھل کر اس وار کی تندی کو کم کیا لیکن بچتے بچتے بھی اُس کی

ٹھوڑی کے نیچے ایک خاصا لمبا زخم پڑ گیا۔ ایسے خوفناک تلوار باز سے محض بچاؤ کرتے رہنا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ فاؤسٹ نے بھی وار پر وار کرنا شروع کیا تاکہ ویلنٹین کو تھکا دے یا اُس کے ہاتھ سے تلوار گرا دے۔

"مار۔ مار فاؤسٹ۔ مار!"

اُسے میفسٹو کی آواز سنائی دی۔ اور ویلنٹین کے پیچھے وہ اس طرح کھڑا نظر آیا کہ چہرے سے بدی اور خونخواری ٹپک رہی تھی۔ فاؤسٹ کے حملوں نے ویلنٹین کو پیچھے ہٹانا شروع کیا۔

فاؤسٹ نے چیخ کر کہا "اپنی تلوار روکو۔ میں تمہارا خون نہیں بہاؤنگا!"

میفسٹو نے پھر آواز دی "مار فاؤسٹ۔ مار!"

اتنا کہہ کر اُس نے اپنی تلوار کھینچی۔ اس کا سرا پکڑ کر کمان کی صورت میں اُسے خم دیا اور اس طرح مسکرا کر جیسے کوئی منہ چڑاتا ہو اور نہایت بے توجہی سے تلوار سیدھی کر کے ویلنٹین کی پیٹھ میں گھونپ دی۔

ویلنٹین گر پڑا اور میفسٹو جلدی سے اُس پر جھک کر کھڑا ہو گیا اور بولا:-

"بھاگ فاؤسٹ، بھاگ۔ تُو نے اسے مار ڈالا۔ جلدی۔ گشت والے اب آتے ہی ہونگے!"

لیکن فاؤسٹ بھونچکا کھڑا تھا۔ کبھی گھبرا کر اپنے چاروں طرف دیکھتا تھا، کبھی اپنے قدموں میں ویلنٹین کو پڑے دیکھتا تھا اور کبھی اُس مدھم روشنی کی طرف

جو مکان میں دکھائی دے رہی تھی۔
میفسٹو نے ایک نظر فاؤسٹ کی طرف دیکھا۔ پھر بازار کی طرف دوڑا اور منہ پر ہاتھ لگا کر چیختا گیا۔ "قتل! قتل!"
آس پاس کے ہر گوشے میں بھاگ بھاگ کر اُس نے یہی خوفناک آواز لگائی۔
"قتل۔ قتل۔ خون، خون!"
کھڑکیاں زور زور سے کھلیں۔ شب خوابی کی ٹوپیاں پہنے لوگ اُن میں سے جھانکنے لگے۔ گھبرائی ہوئی تیز تیز آوازیں سنائی دے رہی تھیں "کہاں؟ کب؟ کس طرح؟"
اس کا جواب وہی خوفناک آواز تھی جو بار بار گونج رہی تھی:۔
"قتل، قتل، خون، خون، ! دوڑو، دوڑو! قاتل بھاگ رہا ہے، دوڑو!"
اُلٹے سیدھے کپڑے پہنے لوگ گھروں سے نکل نکل کر بھاگے۔ بعض کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں اور میفسٹو کی آواز ان کی رہنمائی کر رہی تھی۔ "ادھر ادھر۔ جلدی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قاتل بچ کر نکل جائے"
میفسٹو تیز دوڑ کر فاؤسٹ کے پاس پہونچا اور اُس کا ہاتھ گھسیٹ کر بولا۔ "بھاگ! بھاگ! دیکھ اُن کے قریب آنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں اس شہر میں تجھے بچا نہ سکونگا کیونکہ تُو نے خون کیا ہے"
فاؤسٹ نے اپنی محبوبہ کے گھر پر آخری حسرتناک نظر ڈالی اور بڑی دلسوزی

سے آواز دی۔" مارگریٹ۔ مارگریٹ!"

میفسٹو نے چپکے سے کہا۔" اگر تو یہاں ٹھیرے گا تو اس پر اور بھی مصیبت پڑیگی۔ چل۔ جلدی کر ابھی، ورنہ سمجھ لے کہ تو پکڑا گیا اور پھر کبھی اسے نہ دیکھ سکے گا!"

اتنا کہکر فاؤسٹ کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور رات کی تاریکی میں بھاگ کر روپوش ہوگیا۔

ویلینٹین کے گرد حواس باختہ مردوں اور چند عورتوں کی بھیڑ لگ گئی سب کے سب نیم برہنہ تھے۔ بعض صرف ایک لمبا لبادہ پہنے تھے اور بدن پر کچھ اور نہ تھا۔ جلدی میں جو چیز جس کے ہاتھ لگی لے دوڑا۔ کسی کے ہاتھ میں لکڑی تھی، کسی کے کچھ کسی کے کچھ۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ہوا کیا اور وہ کون تھا جو قتل قتل کی آواز لگا رہا تھا جسے سُنکر وہ اپنے بچھونے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ آئے تھے لیکن ایک بات کا علم انہیں ضرور تھا۔ اور وہ یہ کہ باغیچے میں ایک دلیوزاد آدمی یا تو مرا پڑا تھا یا دم توڑ رہا تھا۔ اسکے پہلو میں خون کا ایک چھپر تھا۔ اس میں سے جتنا زمین میں جذب ہو رہا تھا اس سے زیادہ سینے اور پیٹھ میں سے بہہ بہہ کر جمع ہو رہا تھا۔

ایک نوجوان نے جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی آگے بڑھکر اسکا سر اُٹھا اور بولا۔" ارے یہ تو ویلینٹین ہے۔ اور لو دیکھو کسی نے اُس کے سینے میں خنجر بھونکا ہے۔" پھر اُس نے پیٹھ پر کپڑے ٹٹولے جو خون میں لت پت ہو رہے تھے اور بولا۔

"نہیں یہ تو کسی نے تلوار بھونکی ہے۔ قاتل نے پیچھے سے وار کیا ہے اور تلوار سینے میں سے پار ہو گئی ہے۔"

دروازہ پر شور و غل سنکر مارگریٹ گھر سے باہر نکل آئی۔ اسکے چہرے پر ایسی زردی پھیلی ہوئی تھی کہ دیکھنے سے خوف آتا تھا اور اس کی آنکھیں اس طرح پھٹی ہوئی تھیں جیسے کسی دیوانے کی ہوں۔ وہ کانپ رہی تھی اور جب اس نے دیکھا کہ ایک بھیڑ کسی کو گھیرے ہوئے نیچے کی طرف دیکھ رہی ہے تو وہ بری طرح لرزنے لگی اور خوف و غم سے ہاتھ ملنے لگی اور منہ سے چیخ نکل گئی۔ ابھی ابھی جو حادثہ اس پر گزرا تھا وہ اس قدر دہشتناک تھا کہ اگر وہ اس پر بہت اہوتا تو یہی کہتی کہ اس کے بعد زندہ رہنا کیسے ممکن ہے! جب وہ اپنے عاشق سے ہم آغوش تھی اور دروازے کا ایک دم سے کھلنا، اس کی ماں کا کمرے میں بجھتی ہوئی روشنی کو لیکر داخل ہونا اور پھر اس کو دیکھکر ماں کی دردناک چیخ، لڑکھڑا کر واپس جانے کی کوشش میں گرنا اور سر کا دیوار سے ٹکرانا۔ سب کچھ اس نے دیکھا تھا۔ مارگریٹ نے دوڑکر ماں کا سر اٹھایا تھا اور بڑی التجا سے اسے آواز دی تھی لیکن ماں کی آواز پھر اسے سننی نصیب نہ ہوئی۔ نہ تو وہ محبت سے بولی اور نہ خفگی سے کچھ کہا۔ ماں کی آنکھوں نے نہ تو شفقت سے اسکی طرف دیکھا اور نہ ناراضگی سے۔ مدھم روشنی میں اس نے جو کچھ دیکھا اس سے گویا ماں پر بجلی گر پڑی۔ ایک لمحہ میں اس کے سارے سیدھے سادے خیالات، گھر کی مسرتیں، مارگریٹ پر جو اسے ناز تھا، زندگی بھر اس کے جو اصول اور عقائد تھے،

سب غارت ہو گئے تھے۔ موت نے گویا اس پر ترس کھایا تھا کہ اُس کی زندگی چھین لی تھی۔ وہ زندگی جو اگر اب باقی رہتی تو موت سے بدتر ہوتی۔

شروع شروع میں مارگریٹ سمجھ بھی نہیں سکی کہ کیا ہو گیا، لیکن جب اُس کے ہیجان زدہ ذہن میں صداقت آشکارا ہوئی تو خوف سے اُس کی چیخ نکل گئی اور وہ گھٹنوں ہی پر جھکی جھکی ماں سے محبت و التجا کے ساتھ طرح طرح کے وعدے وعید کرتی رہی۔ پھر گھر کے باہر شور و غل سنائی دیا لیکن اُس کے لئے یہ بالکل بے معنی تھا۔ پھر یہ شور اُسے رونے کی چیخیں معلوم ہونے لگا اور اُس کے اپنے سانحۂ اندوہ کا ایک جزو محسوس ہوا۔ "قتل" کا لفظ ہر آواز میں گونج رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ خود اُس کے اندر کوئی آواز چیخ کر یہی لفظ دوہرا رہی ہے اور اسے اس کا مجرم قرار دے رہی ہے کہ اپنی ماں کو ابدی سکوت میں دفن کر دیا۔

بڑھتے ہوئے شور نے آخرکار اُس کے احساس کے بند دروازے کو کھٹکھٹایا۔ ایک خوفناک خیال ایک دم سے اُس کے معطل متخیلہ میں آیا۔ غم و اندوہ! ہر طرف غم و اندوہ! اُس کی ماں ـــــ خود اور اب شاید ـــــ اُس کا عاشق۔ ماں کے پہلو میں سے بڑی مشکل سے اُٹھی اور گھسٹ کر زینے تک پہونچی۔ اُس پر سے گرتی پڑتی اُتر کر نیچے باغیچہ میں پہونچی۔

مجمع کو نیچے پیروں کی طرف کسی چیز کی طرف تکتے دیکھ کر اُسے غش آنے لگا۔ پھر چیخ مار کر وہ مجمع میں گھس گئی اور دھکا پیل کر کے کسی نہ کسی طرح بیچ میں پہونچی

اور خون میں لتھڑے ہوئے دیوزاد نوجوان پر "بھائی، پیارے بھائی" کہتی ہوئی گر پڑی۔

جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو بھائی کا مُنہ تکتے پایا۔ اُس کی آنکھیں کھُلیں، محبّت اور تعجب کی نظروں سے بہن کی طرف دیکھا۔ یقیناً یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب تھا۔ بے معنی خواب، جو اُسے سُنائے گا اور پھر دونوں بھائی بہن اس خواب پر بھی اُسی طرح ہنسیں گے جس طرح اور بہت سی بیوقوفی کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے۔ نہیں وہ پورا خواب بہن کو نہیں سُنائے گا! نہیں۔ سیاہ لباس والے شیطان نے اُس کی بہن کے متعلق جو کچھ کہا تھا اُس کا ذکر نہ کرے گا اور نہ اُس کے ...... لیکن اس کے گرد یہ بھیڑ کیسی لگ رہی ہے — اور یہ پیٹھ اور سینے میں درد کیسا ......؟ یہاں وہ کیوں ......؟ ایک دم سے اُس کی یادداشت کارفرما ہوگئی اور اپنی تمام خوفناکی کے ساتھ۔

اُس نے درد سے چیخ کر کہا۔ "مجھے ہاتھ مت لگا۔ تیرے عاشق نے میرے جسم کو مار ڈالا مگر تُو نے اُس سے بھی زیادہ گہرا زخم پہونچایا ہے۔"

مارگریٹ سرگوشی کی آواز میں صرف اِتنا کہہ سکی "آہ! بھائی نہیں نہیں میرے بھائی!"

وہ نفرت سے مارگریٹ کو ہٹا کر بولا۔ اور اب کے اُسکی آواز اور بھی نحیف تھی۔ سِسک سِسک کر بولا "چاندی کی وہ زنجیر جو میں نے تجھے دی تھی ...... تیری کلائی میں جو پہنائی تھی ...... جس میں یسوعؑ کی صلیب لٹکی ہے ...... روڑا

کی سب سے نیک اور معصوم لڑکی کے لئے! کیا تو اُسے پہنے گی؟ ہمیشہ پہنے رہے گی جیسا کہ تُو نے کہا تھا؟ اپنے بڑے بھائی کی یادیں جس کو تُو نے قتل کر دیا ہے؟"

"نہیں۔ اچھی نہیں ایسا نہ کہو" مارگریٹ نے ایک دلدوز چیخ مار کر کہا۔ اور جلدی سے سیدھی کھڑی ہو دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھُپا لیا۔

ویلنٹین نے اپنے بھاری پپوٹے آہستہ آہستہ پہلی مرتبہ کھولے اور اُس کی طرف رحم آمیز نگاہ سے دیکھکر شدّت تکلیف سے سانس لیا اور کہا۔

"میرے جھڑکنے کی آواز تُو آئندہ کبھی نہ سُنے گی۔ لیکن کیا میری غمزدہ ماں سے تو اپنی نیلی معصوم آنکھیں چار کر سکے گی؟"

ایک گھُٹی ہوئی چیخ کے ساتھ مارگریٹ بھیڑ کو چیرتی ہوئی اندھا دُھند اپنے گھر کی طرف اُفتاں و خیزاں چلی۔ مجمع میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ پیدا ہوئی اور اس میں غیظ و غضب کا جُزو بھی شامل تھا۔

ویلنٹین پھر بولا لیکن بڑی کوشش سے رُک رُک کر۔

"میرے جنازے کی نماز پڑھوانا۔ پھر اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا جو سب بیسواؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے...... شکنجہ" اتنا کہہ کر انتہائی درد و تکلیف سے اپنا ہاتھ تھوڑا سا اُٹھایا اور بولا۔ "مجھے میری تلوار دو۔"

لاٹھی والے نوجوان نے جلدی سے اُس کی تلوار پہلو میں کھڑی کر دی۔ اور اُس کے قبضے پر ویلنٹین کی مُٹھی بھنچ گئی۔ تھوڑی دیر تک تلوار اُس کے

پہلو میں اس طرح کھڑی رہی کہ قبضہ زمین پر ٹکا ہوا تھا۔
ویلنٹین کی سسکتی ہوئی آواز سُنائی دی "سپاہیانہ موت نہیں ......
مگر اپنی تلوار کے ساتھ۔"
پھر اُس کا منکا ڈھلک گیا اور تلوار ایک جھنکار کے ساتھ زمین پر آ رہی۔

چھٹا باب

روڈا کا گرجہ خوب بھرا ہوا تھا۔ ماں اور بیٹے کی ایک ہی رات میں اسد رجہ غمناک موت کا ہر ایک کی زبان پر ذکر تھا۔ اب یہ سب جمع ہو کر مرنے والوں کی رُوحوں کے لئے دُعا خوانی کر رہے تھے۔ گرجہ کے باہر ایک ستون کی آڑ میں کھڑی دروازے کی جھری میں سے مارگریٹ اندر جھانک رہی تھی۔ وہ اب بھی لڑکی سی معلوم ہوتی تھی؛ سیدھی سادی اور نازک لیکن اس کے چہرے پر نوعمری کے آثار اب معدوم تھے۔ چہرہ دھوئے کپڑے کی طرح سفید پڑا تھا اور اس پر نہ خوشی ظاہر تھی نہ غم۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ شدتِ غم نے اُس کے خدوخال جامد کر دیئے تھے۔ آنکھیں پھیلی ہوئی اور غمناک تھیں لیکن اُس کے آس پاس جو کچھ ہو رہا تھا اُس کا احساس اُن میں مطلق نہ تھا۔ نہ تو آنے جانے والوں کو وہ دیکھ رہی تھی اور نہ دُعا خوانی کا اثر اُن میں نمایاں تھا۔

اس منظر کو وہ جھری میں سے اس طرح دیکھتی رہی گویا وہ ایک ایسی چیز تھی جو اُس کی حدِ نظر سے پرے تھی، کوئی چمکدار تصویر تھی جو اُس کی نظروں کے سامنے آگئی تھی۔

رنگین لیکن بے معنی۔ کوئی پُر اسرار تصویر تھی جسکو سمجھنے کی اُس میں صلاحیت نہیں تھی۔ اُس نے لوگوں کو سر جُھکائے دیکھا، حمد گانے والے لڑکوں کو آہستہ آہستہ جُھک جُھک کر اُترنے اور گاتے دیکھا، پادریوں کو دُعا خوانی کرتے دیکھا لیکن اُس کی نگاہیں ہمیشہ دو بڑی سی اُبھری ہوئی چیزوں کی طرف کھینچکر جم جاتی تھیں جو پہلو بہ پہلو رکھی ہوئی تھیں۔ اُس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ دو ناگوار چیزیں ہیں، ایسی چیزیں جن سے اُس کی رُوح بچنا چاہتی تھی اور جن کے متعلق آگے کچھ معلوم کرنے سے اسکی طبیعت دیوانہ وار اجتناب کرتی تھی۔ اُن دو مخملی چادروں کے نیچے اُسے معلوم تھا کہ کوئی چیز نہایت خوفناک ہے لیکن یہی کوئی چیز اُسے آواز دے رہی تھی اور اُسے میٹھا میٹھا درد محسوس ہوتا تھا اور بھولی بسری باتیں یاد آتی تھیں۔

دروازہ ایک دم سے بند ہوگیا اور اندر سے اُسے بڑے پادری کے کچھ کہنے کی آواز اور بہت سے آدمیوں کے جواب دینے اور آمین کہنے کی بھنبھناہٹ سُنائی دی۔

ایک حمد گونجنے لگی اور مارگریٹ کو اُس کے الفاظ یاد آ گئے:۔

"یہ کائنات بھی لرزیگی۔
جب مُردے جاگ کے اُٹھیں گے۔
اور مالک اُن سے پوچھے گا"

بیشک مُردے جاگ گئے اور جتنے نیک بندے تھے سب یکجا ہو گئے اور

نورِ خداوندی میں نہا گئے۔ موت بھی کیسی نعمت ہوگی، آرام سے ہو جانا، اور ایک بار پھر اُن محبوب ہستیوں سے ملنا جو بچھڑ گئیں ہیں! لیکن مارگریٹ کے خیالات پر کیسی دیوانگی چھا گئی۔ اُس کا تو کوئی عزیز مرا ہی نہیں تھا۔ وہ تو تنہا تھی، بالکل تن تنہا۔

پھر ایک حمد گرجہ میں سے گونجتی ہوئی اُس کے کانوں تک آئی :-

"جب منصف تخت پر بیٹھے گا۔

سب عیب عیاں ہو جائیں گے ۔"

عیب! شرمناک بھید! یہ کیا ہوتے ہیں؟ مارگریٹ نے یہ حمد سینکڑوں ہی دفعہ تو گائی ہوگی اور ہمیشہ اُسے ان الفاظ پر اچنبھا ہوتا تھا۔ شرمناک بھید! کیا جھوٹ بولنا؟ یا شاید وہ شیریں خیالات جن کی پرورش وہ تنہائی میں کرتی تھی۔ لیکن یقیناً اُن میں کوئی عیب کی بات نہیں۔ وہ راز کی باتیں تھیں اور اُن میں وہ اپنی پیاری ماں کو بھی شریک نہیں کر سکتی تھی ....

حمد ختم ہو گئی۔ دُعا مانگنے کی بھنبھناہٹ سُنائی دی اور پھر سب نے مل کر آمین کہا۔ قدموں کی آواز آئی اور دروازہ کھُل گیا۔ لوگ سر جھُکائے باہر نکلنے لگے۔ مردوں کی ٹوپیاں ابھی اُن کے ہاتھوں ہی میں تھیں اور وہ ایک قطار سی بنائے ہوئے تھے۔ جنازے اُٹھائے گئے اور پادری کے پیچھے پیچھے گرجہ کی پُشت کی طرف یہ سب چلے۔ اِن میں سے بعض نے مارگریٹ کی طرف اچٹتی نظر

سے دیکھا اور اُس کے بے اثر چہرے کو دیکھتے گئے۔ ایک بُڈھے نے اپنے برابر والے سے کہا "عجیب دُنیا ہے! ذرا سوچو تو سہی کہ بعض عورتیں ایسے بچّے جننے کی آرزو میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتی ہیں۔"

اِس کا جواب یہ ملا "جی ہاں! اور پھر کیسی بھولی بھالی معلوم ہوتی تھی۔ کیسا دھوکہ دیا ہے اِس نے سب کو۔ ذرا اس کے چہرے کو تو دیکھو جو ملال کی کوئی شکن بھی اس پر ہو۔ ماں اور بھائی کو موت کے گھاٹ اُتار کر بھی اپنے عاشق کے دھیان میں لگی ہوئی ہے۔ اس پر تو شیطان ہی عاشق ہوا ہوگا۔"

جب جنازے مارگریٹ کے سامنے آئے تو بے اختیاری میں اُسکے ہاتھ اُن کی طرف خود بخود پھیل گئے۔ یہ لوگ اُن چیزوں کو لے جا رہے تھے جن سے اُسے ڈر لگتا تھا۔ لیکن ابھی اُنہیں لے نہیں جانا چاہیئے کیونکہ اِن سے اُسے کچھ کہنا تھا۔ وہ کیا بات تھی جس کے کہنے کی آرزو اُس کے دل میں اس قدر شدید تھی؟ یہ ایک پیغام تھا، آخری پیغام، اور اس پیغام کے اتنے سارے الفاظ تھے کہ وہ اُس کو یاد نہ رکھ سکی۔ وہ اُسکے سامنے سے گزر رہے تھے اور آیندہ وہ اُنہیں کبھی نہ دیکھ سکے گی۔

جیل کیطرح سے اس کی یادداشت عود کر آئی۔ بھیانک واقعات کی یاد تازہ ہوگئی۔ گزشتہ دو دن کا سوہانِ رُوح اس کی ماں کی اندوہناک موت، اُس کے پیارے بھائی کا دردناک قتل اور اُس کے نیم جان لبوں سے نفرت کا اظہار، اُسکے

عاشق کی فراری، اُس غمکدہ میں دو نعشوں کے ساتھ تنہائی کی طویل گھڑیاں، ہمسایوں رہگیروں کی چہ میگوئیاں......

ایک نحیف سی چیخ مار کر وہ جنازوں پر گری لیکن کلیسا کے ایک خادم نے بغیر اُس کی طرف دیکھے ہوئے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور وہ اُس ستون سے ٹکرا کر سنبھلی جس کے قریب وہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں وہ دبکی کھڑی ہاتھ ملتی رہی، دیوانوں کی طرح پھٹی آنکھوں سے آہستہ آہستہ گزرتے جنازوں کو دیکھتی رہی اور اُس کے لب جلدی جلدی ہل رہے تھے گویا گڑگڑا گڑگڑا کر التجا کر رہی تھی۔

آخر میں خالہ مارتھا آ رہی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جب اُس نے مارگریٹ کو ستون کے پاس دبکے دیکھا تو اس کا چہرہ سخت ہو گیا اور اُسے اس طرح گھور کر دیکھا گویا وہ مجرم تھی۔ لڑکی نے اُسے دیکھا۔ اب ساری دنیا میں صرف یہی ایک اُس کی رشتہ دار رہ گئی تھی۔ مارگریٹ اُسے دیکھکر چیخی اور امداد کے لئے اُسکی طرف ہاتھ پھیلا دئے۔ لیکن خالہ مارتھا کی آنکھیں اُسے بے رحمی سے گھورتی رہیں۔ ان میں وہ ہمدردی نہیں تھی جو پہلے ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ بلکہ اب اُن میں غصّہ اور حقارت نمایاں تھی۔ اُس نے چیخ کر کہا:۔

"تو! یہاں آنے کی ہمّت! اری رنڈی کیا تیری ساری شرم و حیا غارت ہو گئی! دیکھ تیرے جسم کی خواہش اور دولت کی لالچ نے تجھے کس ہدڑے کو پہونچا دیا۔ کتنی ہی دفعہ منع کیا تھا تجھے!"

پھر مارگریٹ کے دیکھتے دیکھتے سب لوگ گرجا کے عقب میں غائب ہو گئے۔

اس کی محبوب ہستیوں کے جنازے روپوش ہوتے ہی اُس کے خیالات پھر اُمنڈ آئے اور اُس کا کرب و صعب اور بھی زیادہ شدید ہو گیا۔ بہت سی باتوں کی یاد اُس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ خوشی کے قہقہوں کی یاد، اعتبار و اعتماد، خوشیاں منانا، بعض غم کی باتوں کی یاد، اور ان سب نے مل کر اُسے اُن سے جکڑ دیا جو اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے تھے۔

وہ کانپنے لگی اور گلے سے عجیب طرح کے رونے کی آوازیں نکلنے لگیں، لیکن اُسکی آنکھیں خشک تھیں کیونکہ وہ اب رو بھی نہیں سکتی تھی۔

ساتواں باب

ایک ہفتہ پہلے تک مارگریٹ کی زندگی یکسر معصوم و پُرمسرت تھی۔ بچپن میں جب اُس کے باپ کا انتقال ہوا تھا جب سے اب تک اُس کے گھر میں غم کی ہوا تک داخل نہ ہوئی تھی۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ جب کسی لڑائی کے موقع پر اُس کا بھائی جُدا ہوتا تو اُسے صدمہ ہوتا لیکن اس کا بدلہ اُس بے انتہا خوشی سے ہو جاتا تھا جب وہ فتحمند واپس آتا تھا۔

مارگریٹ کی مسرتیں سیدھی سادی ہوتی تھیں لیکن اُس کی زندگی ان سے چھلکتی رہتی تھی۔ کیونکہ ذرا ذرا سی بات پر اُس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگتا تھا۔ پرندوں کی چہکار، پھولوں کی مہکار، صبح کی ٹھنڈی ہوا، تازہ ہوا کے خلاف دوڑنا، معمولی سا تحفہ، کوئی نیک کام یا چند محبت کے الفاظ اُسے لبریزِ مسرت کر دیتے تھے۔ اسکی دلچسپیوں کا کوئی شمار نہ تھا کیونکہ جتنی چیزیں اس کے گرد ہوتی تھیں اُن سب سے وہ لُطف اُٹھاتی۔ پڑوس کے بچّوں کے ساتھ کھیلتی، گاتی اور ناچتی۔ اپنے بڑے بھائی کی عجیب و غریب کہانیوں اور ہنسی مذاق کی باتوں پر خوب ہنستی اور گھر کے کام

کاج میں دل لگا کر مصروف ہوتی۔

پھر اُس کی زندگی میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا جس سے شروع شروع میں اُسے ڈر لگا۔ لیکن اس نئی قوت نے جلد ہی اُسے جذب کر لیا اور زندگی اس کے لئے ایک ایسی دُنیا بن گئی جس کی کوئی حد نہیں تھی۔ گویا ایک لا محدود دُنیا میں اُس نے اب پھر جنم لیا تھا۔ پہلے تو گویا وہ زندگی میں چہکتی تھی اور پھُدکتی تھی اور اب بڑے بڑے پر لگائے آسمان میں اُڑ رہی تھی۔

یکایک، ایک ہی رات میں، زندگی کے وہ سارے خوف و خطر اُس پر ٹوٹ پڑے جو اَب تک یونہی گزر جایا کرتے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ موت کیا ہوتی ہے لیکن اُس رات کو اس کی ماں اور بھائی دونوں نے اُسکی آنکھوں کے سامنے دم توڑا۔ اُس کے لئے یہ سانحے یوں اور بھی عذاب بن گئے کہ دونوں کی موت کا سبب وہ ہستی تھی جس نے اُس کی زندگی میں اس درجہ عجیب و غریب تبدیلی کی تھی، اور جس کی رُوح اس کی اپنی رُوح میں گھُل مِل گئی تھی۔

وہ اپنے اُسی گھر میں بیٹھی ہوئی تھی جو اُس کے گیتوں اور قہقہوں سے گونجتا رہتا تھا، ماں کی محبّت آمیز باتوں اور بھائی کے گرجدار ٹھٹھوں سے آباد رہتا تھا۔ لیکن اب وہی گھر اُجاڑ اور بھیانک بن گیا تھا۔ اُس کا دل سرد پڑ گیا تھا اور غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کی آخری دل شکن نظر دیکھی اور اپنے سسکتے بھائی کی نحیف حقارت آمیز ہنسی سُنی اور وہ کبھی نہ فراموش ہونے والے الفاظ جو آخری وقت

اُس کے مُنہ سے نکلے تھے۔ کیا اُسے اپنے گناہوں کی سزا مل رہی تھی؟ اُسے یہ نامنصفانہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا وسیع القلب بھائی اور متقی و پرہیزگار ماں دونوں کے دونوں اس قدر غمناک موت مرے، اور اُن کے آخری خیالات محض اس کے گناہ کی وجہ سے اِس درجہ تکلیف دہ ہوئے۔ لیکن اُسے سب سے زیادہ رنج اپنے عاشق کی فراری کا تھا۔ اب صرف اُسی کا خیال تھا جس نے اُسے زندگی سے وابستہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنے عاشق پر غور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ محبّت کے پہلے بوسے میں اُس نے اپنی رُوح اور اپنا کل اعتماد اُسے سونپ دیا تھا۔ بس اب تو اس کی محبّت ہی تھی جو اُس کی زندگی میں کچھ اہمیت رکھتی تھی۔

مارگریٹ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ غم کی اتھاہ گہرائیوں میں پہونچ گئی ہے۔ کوئی انسان اس سے زیادہ کرب و صعوبت برداشت کر کے جیتا نہیں رہ سکتا۔

وہ اپنے غموں میں گھری بیٹھی تھی کہ دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ حکم دینے کی ایک کرخت آواز سُنائی دی اور چار سپاہی گھر میں داخل ہوئے۔ یہ کلیسا کے دستۂ محافظ کے سپاہی تھے۔ اُن کے پیچھے پیچھے ایک پادری لمبا سیاہ چُغہ پہنے تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا محضر تھا۔ یہ ایک دراز قد دُبلا سوکھا ہوا آدمی تھا، لمبا سا چہرہ اور چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں تھیں۔

مارگریٹ تھر تھر کانپتی کھڑی ہو گئی کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ خوشی کی خبر اُسے کوئی نہیں سُنائے گا۔ اُس کے دوست اور کُنبے رشتے والے سب کے سب اُسے یا تو

نفرت سے دیکھنے لگے تھے یا بُرا بھلا کہنے لگے تھے، نئے آنے والے اور اجنبی لوگ بھی ان سے کم اور کیا کہتے بلکہ شاید کچھ بُری خبریں ہی اور ساتھ لاتے۔

پادری نے غور سے اس کی طرف دیکھا، ور پوچھا " تُو ہی مارگریٹ ہے، ویلنٹین کی بہن ؟"

مارگریٹ نے کہا۔ "جی ہاں " اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرہ جامد تھا۔

پادری نے محضر کھولا اور پھر کپکپاتی لڑکی کی طرف دیکھکر مہین خشک آواز میں بولا " بڑے پادری صاحب نے آج صبح تیرے گناہوں کو جانچا اور بہت سے گواہوں کی سماعت کی۔ اُنھوں نے اپنا فیصلہ یہ لکھا ہے "حرامکاری کے گناہ کی پاداش میں اور جسم کی ناجائز بھوک سیر کرنے کے جرم میں تجھے سزا دی جاتی ہے کہ چوراہے پر چھ گھنٹے تک شکنجہ میں تجھے کھڑا رکھا جائے تاکہ بدکرداروں کو عبرت ہو اور خود تیری رُوح کو اِس سے فائدہ پہونچے۔ یہ تجھے آج ہی کرنا ہوگا "

مارگریٹ نے جب یہ خبر بد سُن لی تو اُس کا کپکپانا جاتا رہا کیونکہ دل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں یہ بُری خبر فاؤسٹ کی ذات سے متعلق نہ ہو۔

پادری نے پھر کہنا شروع کیا :-

" پھر میری بچی، کفّارہ اور توبہ کے بعد وہ گُناہ جو تُو نے خُدا کے کئے ہیں معاف ہو جائیں گے۔ لیکن تجھ پر اور گُناہوں کا بھی شُبہ ہے ———— انسان کے گُناہ۔ ان کا فیصلہ عدالت دلوانی کرے گی۔ لیکن اگر تُو ہمارے اُن سوالات کا تشفّی بخش

جواب دیدیگی جو ہم تجھ سے اب پوچھیں گے تو تجھ پر آگے مقدمہ نہیں چلایا جائیگا۔
تیرا عاشق کہاں ہے — تیرے بھائی ویلینٹین کا قاتل؟"
"مجھے نہیں معلوم" اور پھر چپکے سے دل ہی دل میں کہنے لگی "کاش مجھے معلوم ہوتا"
"یہ کون شخص ہے؟ اس کا کیا نام ہے؟"
مارگریٹ پھر کپکپانے لگی اور اسکی مٹھیاں زور سے بھنچ گئیں۔ لیکن وہ خاموش رہی۔
پادری نے دیر تک اُس کی طرف گہری نظر سے دیکھا اور اس کا چہرہ سخت پڑ گیا۔
"تیری خالہ نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ کوئی شہزادہ ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ بول!"
مارگریٹ اب بھی خاموش رہی، لیکن اُس کے سانس کی رفتار بڑھ گئی اور آنکھوں کے خوف میں زیادتی ہوگئی۔
"بول!" پادری نے حکم دیا مگر وہ گونگی بنی رہی۔
"تیرے عاشق اور اُس کے ساتھی کا تعلق شیاطین اور ناپاک رُوحوں سے تھا نا؟ مُنہ سے بول! جو کچھ تجھے معلوم ہو، بتادے ورنہ تیرے حق میں بہت بُرا ہوگا"
مارگریٹ نے آہستہ آہستہ انکار میں اپنا سر ہلایا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

پادری نے بے چینی سے سپاہیوں کی طرف پلٹ کر کہا۔ "باندھ دو اِس کی مُشکیں"۔ اور مارگریٹ کی طرف پھر دیکھکر بولا۔ "شکنجے میں کھڑے رہنے کے بعد شاید اللہ تعالیٰ کا رحم تیری زبان کھول دے گا"۔

ایک سپاہی آگے بڑھا اور مارگریٹ کے ہاتھ پیچھے کھینچکر چمڑے کے تسموں سے باندھنے لگا۔ دوسرے نے بڑھکر اُس کے پاؤں میں سے جوتیاں اُتار لیں۔ پھر ان سپاہیوں کے جمعدار نے حکم دیا اور سب کے سب گھر سے باہر نکلے۔ مارگریٹ بیچ میں تھی۔ دو سپاہی آگے اور دو پیچھے۔ اور انکے برابر ذراہٹ کر پادری اپنی آستینوں میں ہاتھ ڈالے چل رہا تھا۔

چورلہے کے بیچوں بیچ چھ گھنٹے تک مارگریٹ شکنجے میں کھڑی رہی اور جب سُورج غروب ہو گیا تو خدّامِ کلیسا آئے اور آکر اُن زنجیروں کو کاٹا جن سے اُس کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے تھے۔

چھ گھنٹے تک وہ اِسی حالت میں ایک چبوترے پر بھوکی پیاسی کھڑی رہی تھی تاکہ تماشائی اُسے اچھی طرح دیکھ سکیں، اُسے مُنہ چڑائیں، آوازے کسیں، مذاق اُڑائیں اور اگر جی چاہے تو اُس کے مُنہ پر تھوکیں۔ شکنجے کے گرد لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور تماشائی چبوترے پر ریلے پڑتے تھے۔ دو سپاہی پہرے پر کھڑے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پہرہ بدلتا رہتا تھا۔ یہ سپاہی بھیڑ کو روکے ہوئے تھے ورنہ مجمع پر ٹوٹ پڑتے اور اُس کے چیتھڑے اُڑا دیتے۔ کبھی کبھی بھیڑ کم ہو جاتی تھی لیکن

ہر وقت وہاں ایسے لوگ موجود ہوتے تھے جو مذاق اُڑاتے اور بُری بُری باتیں کہتے۔ ان میں زیادہ تر شہر کی لڑکیاں شریک تھیں۔ عمر رسیدہ لوگ اُسے کڑی نظروں سے دیکھتے اور اُسے بدی کا نمونہ سمجھ کر کہتے کہ خُدا اس کی بدکرداری کی سزا دے رہا ہے۔ نوجوان اُس کی غمناک آنکھوں کو دیکھکر پسیج جاتے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی کوئی مارگریٹ کی ہیئت کذائی پر فقرہ چُست کرتا اور اس پر اور سب ملکر قہقہہ لگاتے گویا بڑے موقع کی بات کہی۔

لیکن لڑکیوں کی کشش کا کچھ اور ہی جذبہ تھا۔ یہ سب بھیڑ کے بیچ میں تھیں اور مارگریٹ کی طرف اُنگلیاں اُٹھا اُٹھا کر طرح طرح کی باتیں جوش میں کہتی تھیں اور جب تک مارگریٹ شکنجے میں کھڑی رہی یہ سب بھی کھڑی رہیں اور طعنے تشنے دیتی رہیں۔ ان میں سے ایک نے بڑی حقارت سے مسکرا کر کہا:۔

"کیوں مارگریٹ اب اِس تخت پر بیٹھنے کے بعد تیرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا؟ میں سمجھتی ہوں کہ اِن زنجیروں کے لپٹنے میں وہ مزا تو تجھے نہیں آرہا ہو گا جو تیرے عاشق کے لپٹنے میں آیا ہو گا"

ایک اور بولی۔ "اری معصوم مارگریٹ! تو کیسی اچھی رہی کہ اپنی نیک چلنی کے باعث ہم سب سے اتنے بلند مرتبے پر پہونچ گئی!"

لیکن یہ دل لگی بہت جلد بدمزہ ہو گئی کیونکہ جس لڑکی پر ان نشتروں کی بارش کی جا رہی تھی وہ اپنے اطراف و اکناف سے بالکل بے خبر تھی۔ اُس کا چہرہ سفید

اور مرجھایا ہوا تھا۔ کوئی بہت گہرا جذبۂ غم اُس کے دل پر چھایا ہوا تھا۔ اُس کے کان ساری بیرونی آوازوں کے لئے بہرے اور اُس کی آنکھیں کُل بیرونی اشیا کیلئے اندھی تھیں۔ وہ اِنسانی ہستیاں جو اُسکی حمایت کر رہی تھیں ننھے ننھے بچے تھے۔ دو بچے بڑی دیر سے آخیر تک اُس کے شکنجے کے پاس کھڑے رہے۔ ان میں سے ایک چیخیں مار مار کر رو رہا تھا اور دوسرا جو ذرا بڑا تھا بُرا بھلا کہنے والوں پر چیخ رہا تھا اور طعنے دینے والی لڑکیوں کو ڈانٹ رہا تھا۔ لیکن مارگریٹ اپنے ننھے حمائتیوں سے بھی اُسی قدر بیخبر تھی جتنی ان سے جو اُسکی ذلّت پر خوشیاں منا رہے تھے۔

جب سُورج غروب ہوا تو اُس کی زنجیریں کاٹ دی گئیں اور ایک سپاہی نے اُسے پکڑ کر شکنجے میں سے نکال زمین پر اُتارا۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ چبوترے پر سے خود اُتر آئے۔ کیونکہ کمزوری کی وجہ سے وہ بیدم ہو رہی تھی۔ وہ خُون جو زنجیروں کی جکڑبند سے رُک گیا تھا اب پھر رواں ہوا اور اس سے اُسے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ لڑکیوں اور جوان عورتوں کی ایک بھیڑ اس کے گرد لگ گئی اور یہ سب کی سب مل کر اُسے گالیاں دے رہی تھیں۔ جب تک وہ ان میں نہیں گھر گئی وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہی۔

وہ اپنے چاروں طرف حیران ہو ہو کر دیکھ رہی تھی۔ چیخنے والی لڑکیوں کی بھیڑ، شکنجہ، اُس کا محافظ سپاہی، چھوٹا سا لڑکا جو اُسکے قریب کھڑا رو رہا تھا اور اُس کے ہاتھ کو کھینچ رہا تھا، ان سب کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک دم سے

اُسے اپنی زبوں حالی کا احساس ہوا۔ سارے دن میں اب پہلی دفعہ اُس کے رُخساروں پر سُرخی آئی۔ پھر ذلّت اور شرمندگی کی رَو اُس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اُس نے نظریں نیچی کیں اور اپنے ننگے پیروں کو دیکھا اور پھر خوفزدہ ہو کر اس مجمع کو دیکھا جو اُسے گھیرے کھڑا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک تھی جیسے اُس شکار کی آنکھوں میں ہوتی ہے جس کے تعاقب میں شکاری ہو۔ گھبرا کر وہ غضبناکی سے بھیڑ میں بے تحاشہ گھُس گئی اور دوسری طرف نکل گئی۔ لیکن سپاہیوں کے روکتے روکتے کئی لڑکیوں نے اُس پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر بازار میں سے اِس طرح بھاگی جیسے شکاری کتّے اس کا پیچھا کر رہے ہوں اور جلدی ہی اُن سب کو پیچھے چھوڑ اس واحد جائے امان کا رُخ کیا جو اُس کا آخری ٹھکانا تھا۔ غمناک اور اُجاڑ، جس میں بیم و ہراس پہرہ دے رہے تھے اور ان سب سے زیادہ اس کے جملہ عیش و نشاط کا مزار ——— وہی جو کبھی اُس کا گھر تھا۔

جب وہ اپنے گھر پہونچی تو درد سے بُری طرح ہانپ رہی تھی اور اسکی حالت سنبھلتے سنبھلتے کافی وقت گزر گیا۔ تھوڑی دیر تک آرام لیتی رہی اور اُس کا ذہن گذشتہ واقعات کی یاد سے گڈ مڈ ہو رہا تھا۔ پھر اُٹھ بیٹھی اور خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ جس چیز پر بھی نظر پڑتی تھی اُس سے کوئی نہ کوئی دلدوز یاد وابستہ ہوتی تھی۔ ایک کمرے میں سے دوسرے میں گئی۔ الماریاں کھولیں

اور اُن تمام چیزوں کو چھُوا جو اُس کی ماں کے استعمال میں رہتی تھیں۔ کوئی کوئی چیز ایسی ملی جس میں کشیدہ کاری یا سُوئی کا کام اَدھورا رہ گیا تھا۔ اس کے بھائی کی بڑی سی تلوار اَب ایک دروازے کے پیچھے رکھی تھی، اور اُس کے موٹے چمڑے کا سینہ بند تلوار کے اوپر ایک کھونٹی پر لٹکا ہوا تھا۔

اس کے چہرے پر پھر زردی پھیل گئی اور بےحس و حرکت تھا آنکھیں خشک پڑی تھیں۔ اب اُس کمرے میں داخل ہوئی جس میں رہتے سہتے تھے اور جس کی کھڑکی میں سے بازار نظر آتا تھا۔ کھڑکی کے پاس ہی اُس کی اماں کی کرسی اُسی طرح رکھی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی اُٹھکر باورچی خانہ گئی ہے۔ اس کے پاس جا کر مارگریٹ نے محبت سے اس کرسی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر ایک دم سے اس کرسی کے آگے دوزانو ہو گئی اور ہاتھ بڑھا کر اُس سے اس طرح بغلگیر ہونے لگی جیسے کوئی اُس پر بیٹھا ہوا نظر آ رہا ہے اور وہ اُسکی طرف غم آمیز نظروں سے اس طرح دیکھ رہا ہے گویا وہ سمجھ رہا ہے اور معاف کر رہا ہے۔

سسکیوں سے وہ لرزنے لگی اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ اُسکی ایک چیخ نکلی اور یہ چیخ تنہائی اور دہشت کی تھی:۔

"اماں! اماں!"

اٹھواں باب

مارگریٹ روڈا کے چوراہے پر شکنجے میں کھڑی کی گئی تھی۔ اب اس بات کو تقریباً ایک سال ہو گیا۔ یہ سال سختیاں اور مصائب جھیلتے گزرا، اور اُس کے دن بھی اس طرح کٹے کہ کسی طرح کاٹے نہ کٹتے تھے۔ کہنے کو ایک سال مگر اُس کے لئے صدیاں بیت گئیں اور اُس کے لئے زندگی اجیرن ہو گئی۔ اس عرصے میں اُس نے بڑے کڑوے کڑوے جام پئے، لیکن جہاں جام خالی ہوا کہ پہلے سے بھی زیادہ کڑوا چھلکتا جام اُس کے لبوں سے لگ جاتا تھا اور وہ اُس کڑوے گھونٹ کو اپنے حلق سے نیچے اُتارنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ گرمیاں اور خزاں اُس کے لئے ایسے ہی اُجاڑ اور بدرنگ تھے جیسے اب جاڑا جو ملک پر حکومت کر رہا تھا۔

اب کے جاڑا بھی غضب کا پڑ رہا تھا۔ پانچ دن سے برف کی ایک مسلسل چادر پڑ رہی تھی جس میں سورج کی روشنی تک لپٹ کر رہ گئی تھی۔ گاؤں کے کتنے ہی گھر برف کے نیچے دب چکے تھے۔ دس دس اور پندرہ پندرہ فٹ موٹے دَل کی تہیں زمین پر چڑھی ہوئی تھیں اور اُن لوگوں کے لئے جو زمین کے نشیب و فراز سے ناواقف تھے

ایسے میں گھروں سے نکلنا خطرناک تھا۔

روڈ سے سات میل کے فاصلے پر ایک پرانا اُجڑا ہوا کھلیان تھا اُس سے تین تین میل دُور تک کوئی بستی نہیں تھی۔ دیواروں کے تختے گل سڑ کر بہت سے گر چکے تھے اور چھت بھی بس یونہی سی کچھ باقی رہ گئی تھی۔ اِس کھنڈر کے ایک کونے میں تھوڑی سی خشک گھاس پر مارگریٹ سکڑی سکڑائی پڑی تھی۔ سرد برفانی ہوا کی سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی لپٹی لپٹائی چیز تھی جسے اُس نے سینے سے چمٹا رکھا تھا۔

وہ زندگی جس کی ساری اُمیدیں چھن چکی ہوں اتنی ہی سرد ہوتی ہے جتنی کہ موت۔ مارگریٹ بھی اپنی کشمکش زندگی کو کبھی کی چھوڑ چکی ہوتی اگر اس کے دل میں اُمید کی ایک کجلائی ہوئی چنگاری نہ ہوتی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اُس کا عاشق اُسے اِن مصائب سے چھٹکارہ دلانے ضرور آئے گا۔ لیکن مصیبتوں کے کٹھن دن اُس نے کاٹ دیئے تھے، ان میں سے بعض بعض تو ایسے بھیانک تھے کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرنے کا ارادہ ہوتا تھا، مگر اُس کے محبوب کے آنے کی کوئی صورت نہ نکلی۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ اُسکے دل کی چنگاری روشن ہو گئی۔ شروع شروع میں اُسے یقین نہ آیا بلکہ اُس میں یہ سمجھ لینے کی جرأت بھی نہیں تھی کہ خوشی کا یہ وعدہ اُس کے لئے مقدر ہوا ہے۔ جھڑکیاں اور مصیبتیں جھیلتے جھیلتے غم و اندوہ کی وہ اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ اُسکی زندگی

میں خوشی کا آنا اُسے ناممکن معلوم ہوتا تھا، بلکہ اسے ایک ایسی مداخلتِ بیجا تصوّر کرنے لگی تھی جس کا سدِ باب کرنا اُس کے لئے ضروری تھا۔

لیکن جیسے جیسے ہفتے گزرتے گئے اُس کے شبہات رفتہ رفتہ دُور ہو گئے اور اس کی دیوانہ وار اُمید زندگی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ تھا فاؤسٹ کا جواب اُس کی ساری آہ وزاری اور اُس کے تمام آنسوؤں کا جو تنہائی میں اُس کے دُکھے ہوئے دل نے بہائے تھے۔ یہ اُسکی دُعاؤں کا عجیب وغریب جواب تھا کہ اُس کی رُوح روشن ہو گئی تھی۔

مارگریٹ کے اندر جو زندگی اُبھر رہی تھی اُسے وہ پروان چڑھاتی رہی اور اسی میں اپنی طاقت صرف کرتی رہی۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر اُس کا محبوب فاؤسٹ مر بھی گیا ہو یا اگر اس کے لئے یہ مقسوم ہو چکا ہے کہ فاؤسٹ کو آیندہ کبھی نہ دیکھے پھر بھی اُس کا بیش قیمت تحفہ تو اس کے پاس تھا جو ان دونوں کے درمیان ایک ابدی کڑی تھی اور اس تحفے کو وہ دُنیا میں لانے والی تھی۔ باوجود پادریوں اور خدّامِ کلیسا کی سخت گوئی اور ظلم کے شاید خُدا نے اُس کا گناہ معاف کر دیا تھا۔

سب دوستوں نے اُسکی طرف سے مُنہ موڑ لیا تھا کیونکہ کلیسا نے اُسے ملعون ومردود قرار دیا تھا۔ اور اس وجہ سے بھی کہ عام روایت تھی کہ مارگریٹ کا تعلق ابلیس کے کسی غلام سے رہا ہے۔

گھر کا سامان سب بک گیا اور جو تھوڑی سی رقم اُس کے پاس تھی اُسے لیکر اپنے اُس شہر کو چھوڑا جو تکلیف دہ یادوں، دل کو ٹھیس لگانے والی باتوں اور نامہربان نظروں کا گہوارہ بن گیا تھا۔ اب اُسے ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں اُسے کوئی نہ جانتا ہو، اور جہاں محنت مزدوری کر کے اتنا کما سکتی ہو کہ اپنا اور اپنی نوزائیدہ اُمید کا پیٹ پال سکتی ہو لیکن سکون اُس کی قسمت میں ابھی نہیں تھا۔ خُدّامِ کلیسا نے اُس کا کھوج نکال لیا۔ چونکہ انہیں اُسکے عاشق کا نام اور حلیہ معلوم نہ ہو سکا تھا اور یہ اس لئے ضروری تھا کہ اُسے ویلنٹین کا قاتل سمجھا جارہا تھا۔ اس لئے اِن شکاری کتوں سے اپنی جان بچانے کے لئے مارگریٹ کو ایک جگہ چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ایک گاؤں میں مارگریٹ نے سلائی اور کشیدہ کاری کا کام شروع کر دیا تھا۔ اُسے کام بھی ملنے لگا تھا لیکن جب خُدّامِ کلیسا کی زبانی گاؤں والوں کو معلوم ہوا کہ مارگریٹ کون ہے اور اُس پر کیا گزر چکی ہے تو اُنہوں نے اُسے اپنے گاؤں سے نکال دیا اور بعض جگہ تو اس نکالے کے ساتھ جھڑکیاں اور گالیاں بھی ملیں۔ لیکن اُس جان کی خاطر جس کی محافظ وہ تھی اور جسے وہ اپنے اندر کانپتا محسوس کرتی تھی وہ ہر سختی جھیلنے کے لئے آمادہ اور ہر مُصیبت برداشت کرنے کو تیار تھی۔ اُس کی خاطر مشکل سے مشکل اور ناگوار سے ناگوار کام کرنے کو تیار تھی۔ آخیر میں اُس نے آس پاس کے گاؤں میں پھیری پر پھرنا شروع کیا اور گھروں میں اُوپر کا کام کرنے لگی۔ کہیں کپڑے دھوتی، کہیں جھاڑ جھٹکا کرتی، کہیں فرش

اور گھر دھلواتی، غرض گندہ سے گندہ اور ناپاک سے ناپاک کام خندہ پیشانی سے کرتی اور تھوڑی سی تنخواہ ہر گھر سے اُسے ملتی۔ چند مہینے اسی طرح گذرے۔ خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا جُڑتا، اور یہ سب کچھ اسی ننھی سی جان کی خاطر، پیسے جو کچھ بچتے اُنہیں بڑی احتیاط سے اس گٹھڑی میں چھپا کر رکھتی جس میں چند اُونی اور ریشمی کپڑوں کے ٹکڑے بندھے رہتے۔ یہ گٹھڑی ہر دم اُسکے ساتھ رہتی تھی۔

جب وقت قریب آیا تو اُسے یہ خطرہ ہوا کہ اس کا بچّہ بالکل غیر لوگوں میں پیدا ہوگا، اور غیر بھی ایسے کہ اس پر ناک بھوں چڑھائیں گے اور پر چول کریں گے اور جب اُنہیں معلوم ہوگا کہ یہ وہی مارگریٹ ہے تو غالباً گھر سے نکال دینگے، عین اُس وقت جبکہ اُسے آرام اور دیکھ بھال کی ضرورت سب سے زیادہ ہوگی۔ اس خطرہ نے اس کا آرام اور چین غارت کر دیا اور ایک دن چپکے سے رات کے وقت وہ گھر سے روانہ ہوگئی۔

اُس نے دل میں کہا کہ خالہ مارتھا کے گھر چلوں اور اُن سے گڑگڑا گڑگڑا کر رحم کی درخواست کروں۔ گو اُنہوں نے آخری دفعہ بہت سخت باتیں کہی تھیں لیکن جب وہ میری زدہ حالت دیکھیں گی تو اُن کا دل پسیج جائے گا۔ بھلا کون ایسا سنگدل ہوگا کہ جب میں اپنے پیدا ہونے والے معصوم بچّے کا واسطہ دوں گی تو انکار کر دے گا۔ پھر بھلا خالہ مارتھا جو اسقدر نرم دل ہیں اور پہلے مجھے سب سے

زیادہ عزیز بھی رکھتی تھیں، کیسے مُنہ موڑلیں گی؟ بہت دُور کا سفر اُسے پیدل طے کرنا تھا کیونکہ روڈا یہاں سے تین سو میل تھا لیکن مارگریٹ کو اُمید تھی کہ اگر راستہ میں بھیک نہ بھی ملی تب بھی کام کاج اور محنت مزدوری کرتی تین دن میں روڈا پہنچ جائے گی۔

مگر خالہ مارتھا کے گھر تک وہ پہونچ ہی نہیں سکی۔ دوسرے دن کے اختتام پر اُس کی طبیعت بگڑ گئی اور بڑی مشکل سے گھسٹ گھسٹا کر سڑک کے کنارے ایک خالی جھونپڑی میں پہونچی۔ یہاں پہونچ کر بیہوش ہو گئی۔

اُسی رات کو اُس کے ہاں بچّہ پیدا ہوا، لڑکا، کمزور دُبلا پتلا۔ اور جب یہ بچّہ اپنی باریک نحیف آواز میں رویا تو مارگریٹ کو ایسا معلوم ہوا کہ اس آواز میں اُس کی تمام مصائب و آلام کا نوحہ ہے

لیکن مارگریٹ کے لئے یہ بچّہ اُمید کا ستارہ تھا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اُس کا عاشق اُس کے قریب موجود ہے۔ زندگی کی مُرجھائی ہوئی کلی اب پھر کھِل کر پھول بن گئی۔ غم یکلخت معدوم ہو گیا اور مسرّت اُس پر چھا گئی۔ ناقابلِ بیان خوشی اور چین نے اُس کی طبیعت کو شگفتہ کر دیا۔ اپنی ساری زندگی کو آغوش میں لئے نیم بیداری کی حالت میں پڑی تھی اور شیریں خیالات اُس کے چاروں طرف سرگوشیاں کر رہے تھے۔

تین ہفتے بعد مارگریٹ ایک ٹوٹے ہوئے کھلیان کے کونے میں سُکڑی سُکڑائی

مارگریٹ کی طاقت اب جواب دے چکی تھی۔ کھانا تو بہرحال چاہیئے ہی تھی اور گھر اور گرمی کی بھی ضرورت تھی۔ ہاتھ پاؤں سردی سے اکڑ گئے تھے اور جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ اب بچّے نے بھی کمزور آواز میں رونا شروع کیا۔ اب اُسے یہاں سے چلنا چاہیئے تھا تاکہ سر چھپانے کی کوئی جگہ ملے ورنہ خود اور بچّہ دونوں کے بھوک اور سردی سے مر جانے کا اندیشہ تھا۔

بڑی ہمّت کرکے وہ لڑکھڑاتی اٹھی۔ ٹانگیں سیدھی کرنے میں کافی دیر لگ گئی۔ لمبا سفر درپیش تھا جس کے خیال ہی سے دل ڈوبا جاتا تھا۔ جبر کرکے کھلیان کے دروازے میں سے نکلی اور برف کے تودوں پر سے ہوتی ہوئی اُس سمت میں چلی جہاں اُسے خیال تھا کہ سڑک ہوگی۔

تھوڑی ہی دور چلی تھی کہ یہ معلوم ہونے لگا جیسے مدتوں سے برف کے لامتناہی سلسلے پر چل رہی ہے۔ اِس سے اُس کے پیر شل ہو گئے تھے اور بار بار گر پڑتی تھی۔ لیکن آبادی کا کوئی نشان تک اُسے دکھائی نہیں دیا۔ بالآخر اُسے ایک پھوس کی چھت والا گھر دُور سے نظر آیا۔ دیوانہ وار اُسکی طرف دوڑی۔ کہیں ٹھوکر لگی کہیں گری لیکن بچّے کو اِس طرح اٹھائے رہی کہ اُسے کوئی ضرر نہ پہونچے۔

دروازے تک کسی نہ کسی طرح پہونچ ہی گئی اور اُسے کھٹکھٹایا۔ کتنی ہی دیر بعد وہ کھلا اور یہ عرصہ مارگریٹ کو صدیوں لمبا معلوم ہوا۔ دروازہ کھلا تو ایک بدمزاج عورت کا چہرہ نظر آیا جس نے تیز تیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

مارگریٹ کے منہ سے الفاظ بھی نہیں نکلتے تھے۔ بہزار دقّت بولی۔ "پناہ دیجئے، مجھے اور میرے بچّے کو!"

عورت نے اُسے گھور کر دیکھا اور بولی۔ "اچھا اندر آجا۔ باہر تو اکڑ کر مر جائے گی۔"

مارگریٹ نے تکلیف سے سانس کھینچکر شکریہ ادا کیا اور گھر میں لڑکھڑاتی داخل ہوئی۔ کمرے میں کیسی اچھی گرمی تھی! انگیٹھی میں آگ دہک رہی تھی اور چولھے پر جو پتیلی چڑھی ہوئی تھی اس میں سے کیسی اچھی خوشبو آرہی تھی۔ اب اپنے بچے کو کس قدر آرام پہونچا سکے گی! خدا اُسے بھولا نہیں تھا۔ خدا نے اُسے سزا دی تھی لیکن اب معاف کر دیا تھا۔

عورت نے ایکا ایکی اُس کے قریب آکر منہ سے کپڑا ہٹایا اور گھور کر کرخت آواز میں بولی۔ "ارے تو مارگریٹ ہے نا؟ وہی جو روڈا میں شکنجے میں کھڑی کی گئی تھی؟ مارگریٹ بیسوا؟"

مارگریٹ کا منہ کھل گیا اور آنکھیں بند ہوگئیں گویا اپنی زبان خاموش سے کہہ رہی تھی۔ "خدا کے لئے رحم کرو۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔"

عورت بولی۔ "نکل یہاں سے مُردار۔ اس گھر کے لئے تیرا سانس گندہ اور زہریلا ہے!"

مارگریٹ کے منہ سے الفاظ گویا پھٹ پڑے۔ "نہیں نہیں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔ رحم کیجئے۔ میرے بچّے پر رحم کیجئے!"

"دفان ہو، اور اپنے شیطان کے جائے کو لیکر یہاں سے غارت ہو"
مارگریٹ ڈر سے چیخ کر بولی "نہیں، اچھی نہیں۔ میرا بچّہ مرجائے گا۔ رحم کرو"
اتنا کہکر اُس نے وہ گٹھڑی اُس کی طرف دردناک طریقے سے بڑھائی جس میں اُس کا بچّہ لپٹا ہوا تھا۔

"باہر نکل چڑیل، جلدی۔ اس ملعون کو ساتھ لے جا، موئی حرامکار۔"
عورت نے اتنا کہا اور دروازہ کھول کر مارگریٹ کو باہر دھکّا دیدیا اور وہ منہ کے بل برف میں جا پڑی۔

رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور برف باری پھر شدّت سے ہو رہی تھی۔ ہوا سے کچھ بچے ہوئے ایک گڑھے میں کوئی تاریک سی چیز دُھندلی دُھندلی نظر آرہی تھی۔ اس کے چاروں طرف برف کا چٹیل میدان تھا جس کے میلے نیلے رنگ کی مدّھم روشنی چمک رہی تھی۔

یہ مارگریٹ تھی۔ اُس کا سر، کندھے اور بازوؤں کا کچھ حصّہ نظر آرہا تھا باقی برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ اِس وقت زندگی اور موت کی درمیانی حالت اُس پر طاری تھی۔

اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ برف کے ناپیدا کنار فرش پر ہمیشہ چلتے رہنے کی اُسے سزا ملی ہے۔ اور یہ فرش اُس کے پیروں تلے سمٹ رہا تھا اور دب رہا تھا۔ ہاتھوں میں کوئی بہت قیمتی اور نازک سی چیز تھی۔ اسکا بوجھ بڑھنا شروع ہوا اور اُسکے

کانوں میں آوازیں آنے لگیں کہ اِسے پھینک دے مگر وہ نہ مانی۔ اس کا اُسے یقین تھا کہ اس فرش کا سرا ضرور ہے اور اُسے معلوم تھا کہ جب اُس سرے پر پہونچ جائیگی تو وہاں اُسے کون ملے گا۔ وہاں خُدا اپنے تختِ زرّین پر جلوہ فرما ہوگا اور اس کی حضور میں فرشتے حمد و ثنا کر رہے ہونگے۔ اُس کی جناب میں اپنا وہ خزانہ پیش کرے گی جو اتنی دُور سے اُٹھائے لا رہی تھی اور یقیناً اُسے علم ہوگا کہ یہ خزانہ اُس کا بچّہ ہے۔ وہاں اُسے مہر اور رحم کی التجا نہیں کرنی پڑیگی بلکہ ایک لفظ کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ بس جب وہ اپنا بچّہ پیش کرے گی تو سارے فرشتے اُس پر مسکرانے لگیں گے اور سب باتیں ٹھیک ہوجائیں گی۔

وہ کانپی اور یکدم سے چونک پڑی۔ اب وہ کہاں تھی؟ اس کا بچّہ کون لے گیا؟ ہاتھ ایسے سُن ہوئے تھے کہ ٹٹول بھی نہیں سکتی تھی۔ ارے وہ تو گود میں پڑا کمبل میں گرم گرم سو رہا ہوگا۔ وہ پھر اونگھنے لگی اور سمجھی کہ بچّے کو لوری دے کر سُلا رہی ہے۔

گرنے والی برف کے گھنے گالوں میں سے لٹکی ہوئی لالٹینیں قریب آتی دکھائی دے رہی تھیں۔ جب لالٹینیں قریب آ گئیں تو مدّھم مدّھم سی شکلیں بھی نظر آنے لگیں۔ ہتھیاروں کی جھنکار بھی سُنائی دینے لگی۔

تحکّم کی ایک آواز گونجی: "ٹھہرو۔ سامنے کوئی کالی کالی چیز ہلتی نظر آ رہی ہے۔"

دستے نے اپنا رُخ بدلا اور مارگریٹ کی طرف سب کے سب بڑھے۔ یہ خُدّامِ کلیسا کا شب گرد دستہ تھا۔ ایک سپاہی نے اپنی لالٹین مارگریٹ کے چہرے کے قریب کی اور بولا۔ "ارے یہ تو کوئی عورت ہے۔ برف کے جھکّڑ نے اِسے گھیر لیا۔ برف میں آدھی دب چکی ہے۔ بیچاری آدھ موئی ہو گئی ہو گی۔"

دستے کے افسر نے آگے بڑھکر اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں پہچاننے کی چمک پیدا ہوئی پھر اطمینان کے لہجہ میں بولا "چلو اچھا ہوا ہمیں یہ مل گئی۔ یہ وہی مارگریٹ ہے جس کا پتہ چلانے کا حکم بڑے پادری صاحب نے دیا ہے۔ کل اسے اُن کے سامنے پیش کرینگے۔ اِسے کھینچکر باہر نکال لو اور اپنے ساتھ لے چلو۔"

دو سپاہیوں نے اُس کے بازو پکڑے اور اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ مارگریٹ کے ہاتھوں میں سے لپٹا ہوا بچہ چھوٹ کر نیچے قدموں میں گر پڑا۔

ایک سپاہی نے اُسے کھول کر دیکھا اور پھر افسر کی طرف دیکھکر بولا "بچہ ہے بہت چھوٹا، مرا ہوا۔"

افسر کی آنکھیں بھالا کی سے چمکنے لگیں۔

"اِسی کا بچہ ہے۔ تو یہ کہو کہ اپنی بے حیائی اور گناہ کا ثبوت غارت کرنے کی فکر کر رہی تھی۔ پکڑو اِس خونی ڈائن کو۔"

یہ دستہ رُوڈا کی طرف پلٹا۔ دو سپاہی نیم بیہوش مارگریٹ کو سنبھالتے ہوئے

نہیں بلکہ اُٹھائے ہوئے تھے اور ایک سپاہی پیچھے پیچھے اُس کا بچّہ اُٹھائے چل رہا تھا۔
یکایک مارگریٹ کے ذہن میں جان پڑ گئی۔ ڈری ہوئی نظروں سے اپنے گرفتار کرنے والوں کو دیکھا۔ خوف سے دل اُچھلنے لگا۔ چیخ کر بولی" میرا بچّہ کہاں ہے؟ میری ننھی سی جان کو تم نے کیوں چھین لیا؟"

"تجھے خوب معلوم ہے کہ تیرے بچّے کو کیا ہوا" افسر نے غُرّا کر کہا۔"اری ڈائن اپنے گُناہ کو چھپانے کے لئے تو نے اپنے بچّے کو مار ڈالا۔ وہ رہا ہمارے پاس اس کا ثبوت دیکھ!" اِتنا کہہ کر اُس نے گٹھڑی کی طرف اشارہ کیا جسے پیچھے پیچھے سپاہی اُٹھائے لا رہا تھا۔

چند لمحوں تک مارگریٹ گٹھڑی کی طرف گھورتی رہی اور اُن الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتی رہی جو اُس نے ابھی ابھی سُنے تھے۔ جب اُس کی سمجھ میں آیا کہ بچّہ مر گیا تو اُس کی ایک خوفناک چیخ نکلی لمبی اور وحشیانہ۔ پھر اُس نے اُن سپاہیوں کو مارنا شروع کیا جو اُسے پکڑے ہوئے تھے اور اپنے بچّے تک پہونچنے کے لئے مچل گئی۔ لیکن اُنہوں نے اُس کے بازو پکڑ کر اُٹھا لیا اور وہ اُن کے ساتھ چلنے پر مجبور تھی۔

اُس کی عقل و تمیز جاتی رہی تھی۔ ہر چیز اور ہر انسان جس سے اُسے محبّت تھی اُس سے چھین لی گئی تھی۔ سب، سب کچھ جاتا رہا تھا، اُمید کی آخری چنگاری بھی، اُس کا کمزور غریب بچّہ۔

اُس کا سر پیچھے کو گرا ہوا تھا، سپاہی اُسے گھسیٹے لئے جا رہے تھے اور وہ چیخیں مار رہی تھی جیسے کوئی پاگل چیخے۔ چیختے چیختے اُس کے لبوں پر ایک نام آگیا اور وہ اس نام ہی کو بار بار وحشیانہ طور پر چیخ رہی تھی:-

"فاؤسٹ! فاؤسٹ! فاؤسٹ! فاؤسٹ!"

نواں باب

قید خانے کی کوٹھڑی میں مارگریٹ خشک گھاس پر پڑی ہوئی تھی۔ یہ کوٹھڑی بڑے بڑے پتھروں کو چُن کر بنائی گئی تھی۔ اس میں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف اُوپر چھت کے قریب ایک موکھا تھا جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس میں سے اندھی اندھی روشنی کوٹھڑی میں آ رہی تھی۔

کچھ دیر مارگریٹ بےحس و حرکت پڑی رہی۔ پھر اس نے گھاس کو نوچنا شروع کیا۔ مُٹھیاں بھر بھر کر اُٹھائی اور اُس پر محنت سے ہاتھ پھیر کر کہتی "خوشنما پھولو۔ لاؤ اپنے محبوب کے لئے میں تمہارا ایک گجرا گوندھوں۔ اُس کے لئے بادشاہ کا ایک تاج بنائیں۔ اس سرفرازی سے تمہاری عزت افزائی ہوگی نا؟ اُس کی پیشانی پر تمہیں جگہ ملے گی اور وہاں سے جُھک کر تم اُس کی سیاہ آنکھوں میں جھانک کر دیکھوگے!"

اُس نے بڑی تیزی سے خشک گھاس کو گوندھ کر گھیرا سا بنایا اور اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر ہاتھ پھیلا دئے۔ وہ عجیب شان سے سیدھی کھڑی تھی۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور پتھرائی ہوئی۔ لیکن ان میں شرم و حجاب کی جھلک تھی گویا وہ اپنے محبوب

کو دیکھ رہی تھی، مگر اُس سے بات کرنے کی جسارت نہ رکھتی تھی۔ پھر گھاس کا تاج اُٹھایا اور بڑی تمکنت سے اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور جیسے کوئی بھولی بسری باتیں یاد آ رہی ہوں آہستہ آہستہ بولی۔ "دیکھو میں تمہیں اپنی ملکہ بنا کر تاج پہناتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر دبی ہوئی آواز میں، اُس نے وہ گیت گانا شروع کیا جو گھبرے کے کھیل میں بچوں نے وادی میں گایا تھا اور فاؤسٹ آنکھوں میں محبت کی چمک لئے اُس کے قریب آیا تھا:۔

"اوپر ڈھونڈو نیچے ڈھونڈو۔
اُس کے سر پر تاج رکھو۔
تاج تو خوشیاں لائے گا لیکن
بوسہ سے پہلے چھو تو لو۔"

مارگریٹ نے سر پر سے تاج اُتار لیا اور پھر محبت سے اُس پر ہاتھ پھیر کر بولی "خوبصورت تاج۔ میرے لئے تو کتنی خوشی لایا ہے، گو بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں اِس خوشی کی مستحق نہیں ہوں۔

اوپر ڈھونڈو نیچے ڈھونڈو......"

اُس نے پھر گانا شروع کیا لیکن ایک دم سے رُک گئی اور کہنے لگی:۔

"فضول سا تھکا دینے والا گیت ہے۔ بچو آؤ ایک اور گیت گائیں:۔

"ایک دو تین۔

تم آزاد ہو۔
ایک بوسہ اُس کے لئے۔
ایک بوسہ تمہارے لئے۔"
"دیکھا پیارے بچّوں۔ ہے نا اچھا سا گیت؟ بس اُس نے پیار کیا اور تمہارا گھیرا ٹوٹا۔
ایک بوسہ اور پھر میں آزاد ہوں۔"
اُس کے چہرے پر انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ہاتھ سے گھاس کا گجرا چھوٹ کر نیچے گر پڑا اور پتھر کی دیواروں کو گھبرا گھبرا کر دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے گرے ہوئے ہار کی طرف دیکھا۔ اُسے اُٹھانے کے لئے جُھکی مگر اتنے ہی میں اپنا ارادہ بدل دیا اور گھاس ہی پر دوزانو ہوگئی۔ گود میں بہت ساری گھاس اُٹھالی اور اُسے سینے سے لگا کر ہل ہل کر لوری دینے لگی:۔
آنکھیں مُوند، رات کا وقت ہے۔
آنکھیں کھُول، دن کا وقت ہے۔
تیرے ابّا آئے ہیں۔
سونے کی گاڑی میں آئے ہیں۔
ہم کو لینے آتے ہیں۔
سو جا میرے راج دُلارے۔
سو جا میری آنکھوں کے تارے۔

پھول کی ڈنڈی ہاتھ میں تیرے۔
سر پہ ہے پھولوں کا تاج۔
جہاں سُنہری پھول کِھلے ہیں،
بھینی بھینی خوشبو ہے،
وہاں تری سُکھ سیج سجے گی۔
سو جا میرے راج دُلارے،
سو جا میری آنکھوں کے تارے۔

کوٹھڑی کے باہر قدموں کی آواز سُنائی دی۔ قُفل میں کُنجی پھری، مارگریٹ پیچھے ہٹ کر کونے میں دبک گئی اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

دروازہ کُھلا اور محافظ کُنجیوں کا بھاری گچھا لئے اندر آیا۔ یہ ایک بُڈھا آدمی تھا جس کا دل دردناک مناظر دیکھتے دیکھتے سخت ہو گیا تھا۔ اُس کے پیچھے دروازے کے باہر دو سپاہی کھڑے تھے۔ محافظ نے بے جذبہ آواز میں کہا:-

"عدالتِ کلیسا تمہارے مقدمے کی سماعت کریگی۔ اپنے بچے کو مار ڈالنے کی فردِ جُرم تم پر لگائی گئی ہے۔"

مارگریٹ نے ایک چیخ ماری اور محافظ سے لپٹ گئی اور رو رو کر پُوچھنے لگی۔
"تم نے اُسے کہاں چُھپا دیا؟ میرا بچّہ! رحمدل پیرمرد بتاؤ میرا بچّہ کہاں ہے۔ اُسے

کہاں لے گئے ہیں؟"

محافظ نے اپنا کوٹ اس کے ہاتھوں سے چھڑایا اور مارگریٹ پھوٹ پھوٹ کر روتی گھاس پر گر پڑی۔

پھر اس کی طبیعت میں انقلاب سا ہوا۔ وحشیانہ عجلت کے ساتھ وہ اپنے گھٹنوں پر جھکی اور بڑی تیزی سے گھاس کو ہٹانے اور اچھالنے لگی گویا کسی چیز کو تلاش کر رہی تھی۔ پھر مسکرانے اور ہنسنے لگی، اور آپ ہی آپ کہنے لگی "لو اب یاد آیا ہے۔ وہ تو برف ...... کے نیچے آرام سے گرم گرم سو رہا ہے۔"

دسواں باب

مارگریٹ کی پریشانیوں کے زمانہ میں، اس طویل مدت میں اُسے فاؤسٹ کا نہ تو کوئی پیغام پہنچا اور نہ اُس کی کوئی خیر خبر ملی۔ فاؤسٹ کو اُس نے چند بار اپنے خوابوں میں دیکھا تھا ــــ نُور کا ایک مجسمہ جس میں سے محبت اور پیار کی کرنیں نکل رہی تھیں بعض اوقات اُس نے فاؤسٹ کی محبت آمیز سرگوشیاں سُنی تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ بے حقیقت خواب ہیں جو خود اس کے متخیلہ نے بنائے ہیں۔ کئی دفعہ اُس نے اپنی تمام ذہنی قوتوں کو مجتمع کیا اور خلاء بسیط میں انہیں منتشر کیا تاکہ اُس کے محبوب تک پہونچ جائیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ اُس کی محبت اس قدر شدید ہے کہ فاؤسٹ ضرور کبھی کبھی اُس کے وجود کو اپنے نزدیک محسوس کرتا ہوگا۔

اس کا اُسے یقین تھا کہ فاؤسٹ ابھی زندہ ہے، دل گواہی دیتا تھا۔ لیکن اُسکے ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا تھا کہ کسی بہت بڑے خطرے میں گھِرا ہوا ہے۔ مگر فاؤسٹ نے اپنی رُوح کو اس کی تلاش میں کبھی نہیں بھیجا تھا۔ شاید مارگریٹ کا شُبہ غلط نہ ہو۔ فاؤسٹ مر نہ گیا ہو۔ مگر نہیں۔ یہ خیال کرنا دیوانہ پن ہے بلکہ گناہ ہے۔ اُسکی رُوح

میں ایک یقین تھا جسے سارے صدموں نے زائل نہیں کیا، جو اتنا ہی واثق تھا جتنا کہ خُدا کا یقین۔ اور وہ یہ تھا کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے محبوب کو ضرور دیکھے گی۔

مارگریٹ کا خیال ٹھیک تھا۔ فاؤسٹ ابھی دُنیا میں گھوم رہا تھا۔ گو اُس نے اپنی محبوبہ کو کوئی پیغام نہیں پہونچایا تھا تاہم اُس کے خیالات میں وہ ضرور بسی ہوئی تھی۔

ویلنٹین کی موت پر میفسٹو کے کہنے کے مطابق وہ روپوش ہو گیا تھا۔ مگر اس خیال سے اُس کا دل بے چین تھا کہ اپنی محبوبہ کو اُس کے ہاتھوں کس درجہ رنج و غم کا شکار ہونا پڑا۔ تکلیف دہ خیالات کا دَور اس پر گزرا اور نتیجے کے طور پر اُس نے ایک زبردست ارادہ کیا۔ جوانی کا تحفہ خود اُس کے لئے اور اُن کے لئے بھی جن سے اُسے محبّت تھی ایک عذاب ثابت ہوا۔ مارگریٹ پہلی عورت تھی جس سے اُس نے بے لوث اور سچّی محبّت کی لیکن اُس کے لئے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ بس تو آیندہ پھر کبھی وہ اُسے نہ دیکھے گا۔ فاؤسٹ کی قسمت کا منحوس ستارہ اُس کے مطلعِ حیات کو آیندہ کبھی مکدّر نہ کریگا۔

فاؤسٹ کو پوری طرح علم نہیں تھا کہ مارگریٹ کی زندگی اُسنے برباد کردی، اس کا دل توڑ دیا اور ساری عمر کے لئے اس کا چین اور آرام غارت کر دیا۔ اُس کے بھائی کے مرجانے کا اُسے یقین تھا۔ ماں کو گرتے دیکھا تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ مرگئی۔ سوچتا تھا کہ جب اُسے معلوم ہوا ہوگا کہ بیٹی پر کیا سانحہ گزر گیا تو ماں کا دل کیسا کیسا

کٹتا ہوگا۔ اُس نے چاہا تھا کہ اپنی محبوبہ پر اپنی محبّت کے سارے خزانے لُٹا دے۔ مگر اس کے بدلے یہ کیا کہ سانپوں سے بھرا ہوا ایک بکس اُس کے حوالے کردیا بس اب تو یہی کرنا چاہیئے کہ مارگریٹ کی زندگی سے یکسر علیٰحدہ ہوجائے اور اُس کے خیال کو بھی اپنے دل سے اُکھاڑ پھینکے۔

اِس خیال کو بھلانے کے لئے میفسٹو کی ہدایتوں کے مطابق وہ ایک سے ایک نئی دلچسپی میں منہمک ہوا۔ بھیس بدل بدل کر ساری دُنیا کا سفر کیا۔ مشرق و شمال کے دُور سے دُور ممالک میں پھرا اور یورپ کے تقریبًا ہر شہر میں گھوما۔ تاریخ کے گزرے ہوئے زمانوں میں سحر کے زور سے پہونچ گیا اور عیش و نشاط میں غرق ہوگیا کہ کسی طرح اُس غمگین صورت کی حسین لڑکی کی یاد دل سے محو ہوجائے جس کی زندگی کو اُس نے اس بُری طرح برباد کیا تھا لیکن وہ اُس کے ذہن سے ایک لمحہ کے لئے بھی جُدا نہ ہوتی تھی۔

اس وقت فاؤسٹ ایک بہت بڑے غار میں کھڑا تھا۔ میفسٹو کے ارضی مسکنوں میں سے ایک یہ بھی تھا جو اس قدر پوشیدہ اور اُجاڑ مقام تھا کہ انسان کا خیال بھی اُس کی طرف پرواز نہیں کرتا تھا۔ جب سے دُنیا بنی تھی سوائے فاؤسٹ کے کسی انسان نے اس خطّہ پر قدم نہیں رکھا تھا۔ اُس کا چہرہ غم آلود اور سر جُھکا ہوا تھا۔

اُس کے پیچھے اُسکا عکس بد یعنی میفسٹو کھڑا تھا۔

میفسٹو نے تند نظروں سے فاؤسٹ کی طرف دیکھا کہ اِس شخص کے دل سے خصائص خداوندی ابھی تک پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے، بولا "تو اب بھی مطمئن نہیں ہے فاؤسٹ۔ دولت، عورتیں، عیش، علم، اور دُنیا کی ساری طاقتوں پر تجھے اقتدار حاصل ہے۔ لیکن تو اب بھی سوچ میں ہے۔ اب بھی ر دڈا کی اُسی بیوقوف چھوکری کی دُھن سوار ہے۔"

فاؤسٹ غصّے سے پلٹ کر بولا "تُو نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے گناہوں کی سزا مارگریٹ کو مِل رہی ہے۔ میں نے اُس کی آواز سُنی ہے جب میں عشرتوں میں غرق ہوکر اُس کے خیال کو بھُلانے کی کوشش کرتا ہوتا تھا تو اُس کی آواز خلاء کو چیرتی ہوئی میرے کانوں تک آتی تھی اور میں اُس سے بچنے کے لئے اپنی رُوح کو چھپاتا تھا کیونکہ اُس کا جواب دینے کی مجھ میں ہمّت نہیں تھی۔ کل رات کو وہ میرے خواب میں آئی اور اُس کے چہرے پر عجیب بیم و ہراس کے آثار تھے میرا ارادہ مُرجھا گیا۔ مجھے معلوم کرنا ہے کہ اُس پر کیا بیت رہی ہے۔"

میفسٹو نے حقارت سے جواب دیا۔ "اور اگر اُس پر بُری بیت رہی ہوگی تو کیا تیری وجہ سے؟ اُس نے اپنے کرتوتوں سے پادریوں کو اپنے پیچھے لگا لیا جو اُسے اُسکی غلطیوں کی سزا دے رہے ہیں۔"

"اچھا! اُس کی زندگی میں ہمارا کچھ دخل ہی نہیں؟ تو نے ہی تو وہ عرق بنایا تھا جو میں نے اُسے پلایا تھا۔"

فاؤسٹ نے بڑے غصّے سے جواب دیا۔ پھر ایک دم سے اُس نے اپنا سر پھیرا اور کان لگا کر سُننے لگا۔ ہاتھ کی جُنبش سے میفسٹو کو خاموش رہنے کا حکم دے کر بولا "خاموش! میری محبوبہ مجھے پھر آواز دے رہی ہے۔" وہ بجس و حرکت کھڑا رہا، لب سے لب جُدا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مارگریٹ کی آواز اسے سُنائی دے رہی تھی اور اس آواز میں کرب و صعب کی دردناک التجا تھی :-

"میرے محبوب۔ تیری مارگریٹ تجھے پکارتی ہے۔ آ۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اُونچا ہو جائے۔"

فاؤسٹ نے جھنجھلا کر کہا۔ "تو کہاں ہے مارگریٹ؟" مگر کوئی جواب نہیں آیا گو فاؤسٹ دیر تک کان لگائے سُنتا رہا۔ پھر جلدی سے میفسٹو کی طرف پلٹ کر بولا۔ "مجھے دکھا وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔"

میفسٹو کی آنکھیں سُکڑ گئیں اور چہرے سے ناراضامندی ظاہر ہو رہی تھی لیکن وہ تعظیماً جھکا اور بولا "تُو نے حکم دیا ہے۔ اچھا تو دیکھ اُس غار میں۔"

جس غار میں یہ کھڑے تھے اُس کے پیچھے ایک اور چھوٹا غار تھا اور اُس کے تاریک دہانہ میں فاؤسٹ گھورتا رہا۔ اس میں رفتہ رفتہ روشنی چمکنے لگی اور ایک منظر واضح ہوتا گیا۔ یہ منظر اتنا صاف ہو گیا کہ اس میں انسان چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔ بالکل جیسے گوشت پوست کے انسان چل پھر رہے ہوں۔

فاؤسٹ نے دیکھا کہ ایک نیچی سی چھت کا کمرہ ہے۔ اِس میں ایک لمبی میز بچھی ہے۔

اس کے ایک طرف کئی آدمی کالے کالے چغے پہنے بیٹھے ہیں۔ اُس کا دل دھک سے ہوگیا کیونکہ ان آدمیوں کے سامنے مارگریٹ اس طرح کھڑی نظر آئی کہ ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے اور سپاہیوں کا ایک دستہ اُس کی نگرانی کر رہا تھا۔ مارگریٹ اس قدر بدل گئی تھی کہ فاؤسٹ اُس کی موجودہ ہیئت کذائی کو دیکھکر کانپ اُٹھا۔ جب اُسے پہلے پہل دیکھا تھا تو وہ ایک چونچال لڑکی تھی، جنگلوں کی رُوح، گیتوں قہقہوں اور مسرت سے لبریز۔ چہرے سے معصومیت اور خوشی ٹپکتی تھی لیکن اب روشنی اور قہقہوں کے سارے آثار مٹ چکے تھے۔ اب تو حالت یہ تھی کہ اُسے دیکھکر ترس آتا تھا۔ چہرہ پتھر کی طرح جامد اور خود مجسم غم و اندوہ بنی ہوئی تھی۔ سیاہ لباس والوں میں سے ایک کھڑا ہوا۔ فاؤسٹ کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ سر سے اُونچے اُٹھائے اور اُس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان ایک سفید چھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ ایک دم سے جھٹکے اور ان کے جھٹکتے ہی وہ چھڑی ٹوٹ گئی۔ فاؤسٹ نے دیکھا کہ مارگریٹ کے چہرے پر مُردنی چھا گئی اور لبوں سے معلوم ہوتا تھا کہ شدتِ غم سے وہ چیخ رہی ہے۔ پھر یہ ساری شکلیں گڈمڈ ہونے لگیں اور دھوئیں کی طرح بل کھا کر یہ منظر فاؤسٹ کی نظروں سے غائب ہوگیا۔

فاؤسٹ نے ایک خوفناک چیخ ماری۔

"سفید چھڑی! ارے یہ تو موت ہے! میفسٹو! اُسے بچا۔ بچانا پڑیگا تجھے!

اُسے میرے پاس لے آ۔ ورنہ میری ابدی بددعا تیرے لئے ہو۔"
میفسٹو بے رحمی سے ہنس کر بولا "تیری بددعا! کیا میں منتقم کے الفاظ کو بے اثر کر سکتا ہوں! اُس کے انتقام کی بجلیوں کو میں کیسے لوٹا سکتا ہوں! اُسے بچاؤں؟ بھلا اُسے تباہ و برباد کرنے والا کون تھا: میں یا تو ——؟"
"تو میفسٹو! ہر زمانے کی بدی کا محرک! تو وہ غلاظت ہو جس سے چاروں طرف غلاظت پھیلتی ہے۔ تو جس عطیات سے سرفراز کرتا ہے بس ایک آخری تحفہ میں تیرے ہاتھ سے لوں گا۔ مارگریٹ کو بچانے کے لئے مجھے لے چل۔"
"کیا تجھے معلوم نہیں ہو فاؤسٹ کہ روڈا میں تیرے لئے کیا خطرہ ہے؟ تو قاتل ہے۔ روڈا میں تو نے خون بہایا ہے۔ مقتول کے شہر پر انتقام کی رُوحیں قاتل کے انتظار میں منڈلا رہی ہیں۔ روڈا میں تیری قسمت پر میری قوتیں اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔"
فاؤسٹ نے بے صبری سے چیخ کر کہا۔ "مجھے اُس کے پاس فوراً لے چل۔"
میفسٹو کی بھنویں سکڑ کر آڑی ہو گئیں اور اُس نے دیدے چمکا کر کہا۔ "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا۔ تیری امداد کا وقت نکل گیا۔ تیری محبوبہ کے لئے تو چِتا چُنی جا رہی ہے۔"
"ابھی تک تو میرا غلام ہے۔ تیار ہو جلدی۔ ابھی میں تجھے حکم دیتا ہوں۔"
میفسٹو نے سر تسلیم خم کیا۔ چہرہ نفرت و حقارت سے بگڑا ہوا تھا۔ غار کے

دہانے پر آکر بولا "میرے گھوڑے تیار ہیں۔"

باہر میفسٹو کی جہنّمی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس میں چار شب رنگ گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں دہک رہی تھیں، بےصبری سے بار بار اپنا سر اُچھالتے اور زمین پر سُم مارتے تو چنگاریاں جھڑنے لگتیں۔

گاڑی میں دونوں سوار ہوئے اور اس تیز رفتاری سے آسمان میں اُڑے جیسے بجلی کوند رہی ہو، لیکن فاؤسٹ یہی کہے جاتا تھا کہ "تیز چلو اور تیز چلو۔ میں اپنی محبوبہ کو ایک دفعہ اور ضرور دیکھونگا۔ میں اُسے آگ سے ضرور بچاؤنگا۔"

اِدھر تو یہ خلا کو چیرتے چلے آرہے تھے اور اُدھر مارگریٹ کمرۂ عدالت سے نکلکر برف برسے اُس مقام کی طرف لائی جا رہی تھی جہاں وہ جلائی جانے والی تھی۔ یہ ایک نیچی سی پہاڑی تھی جس کی چوٹی پر ایک لوہے کی لاٹ گڑی ہوئی تھی اور اس لاٹ کے چاروں طرف لکڑیوں کے بڑے بڑے گٹھے چُنے ہوئے تھے۔

جب قیدخانہ کی کوٹھڑی سے نکلکر مارگریٹ کو عدالت کلیسا کے سامنے پیش کیا گیا تھا تو وہ اپنے گرد وپیش سے بے خبر تھی۔ جب قیدخانہ کے محافظ نے اُسکے بچّے کا ذکر کیا تھا تو اُس کی یادداشت اُبھر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی غم کی چھریاں بھی اُس کے دل پر چلنے لگی تھیں۔ اس دردناک کیفیت کو اس فریب دل نے گویا ازراہِ کرم زائل کردیا کہ اُسے اپنا بچہ برف ہی سے مل گیا تھا۔ جب عدالت میں گئی تھی تو اُسے یہی خیال تھا کہ اپنے بچّے کو گود میں لئے ہوئے ہے۔

کالے کالے لباس پہنے، سخت سخت چہرے والے آدمیوں نے اُس سے کئی سوالات کئے تھے جن میں سے ایک کو بھی وہ سمجھ نہ سکی تھی۔ یہ لوگ اُسے پادری معلوم ہو رہے تھے۔ بس تو مَیں انہی لوگوں سے کہونگی کہ میرے ننھے فاؤسٹ کو بپتسمہ دیدیں۔ نہیں، یہ نام تو اُسے اپنی زبان سے نکالنا ہی نہیں چاہیئے ورنہ انہیں معلوم ہو جائیگا۔ اُنہیں معلوم ہوجائے گا۔ اب وہ خائف بھی نہیں تھی کیونکہ اب تو سپاہی اُسے گھیرے کھڑے تھے تاکہ اس کے بچے کو کسی قسم کا گزند نہ پہونچے۔

پھر اُس نے اپنے محبوب کا نام سُنا۔ اُس کا جسم کانپنے لگا اور دل میں اندیشہ پیدا ہوا۔ ذہن میں اس کا شائبہ سا آیا کہ اس طرح لوگوں کا اُس کے گرد جمع ہونے کا کیا مقصد تھا۔ اتنے ہی میں ایک غضب آلود آواز اُس کے کان میں آئی "جواب نہیں دے گی تُو؟ تیرے عاشق کا یہی نام ہے نا؟ اِسی کو تُو نے آوازیں دی تھیں نا؟ یہ فاؤسٹ وہی ہے نا جس نے تیرے بھائی ویلنٹین کو قتل کیا ہے؟"

مارگریٹ ایکدم سے چیخ مارکر بولی "نہیں، نہیں! وہ یہ نہیں کرسکتا تھا۔ فاؤسٹ ایسی حرکت کرہی نہیں سکتا!"

اب پھر اس کا حافظہ زائل ہوگیا اور اس پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ وہ لوگ جو اُسے گھیرے ہوئے تھے اور سوالات پوچھ رہے تھے اُس کی اس خود فراموشی کو ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سمجھے کہ دیکھو کیسی دیدہ دلیر اور چالاک ہے کہ اپنے جُرم پر نادم تک نہیں ہوتی اور اسی کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح

ویلنٹین کے قاتل کا پتہ نہ چلنے پائے۔
بالآخر اس کے منصفوں نے چپکے چپکے آپس میں مشورہ کیا:۔
ان میں سے ایک نے کہا۔"اس فاؤسٹ کا پتہ ہم اس سے کچھ نہ چلا سکے۔ اس پر جو الزامات تھے وہ پایۂ ثبوت کو پہونچ گئے۔ بس ہمیں اپنا فیصلہ سُنا دینا چاہیئے"
سب نے بہ اتفاقِ رائے فیصلہ سُنایا۔ چِتا! قاتلہ کو چِتا میں جھونک دیا جائے۔
ایک دُبلا لمبا سا پادری جو بیچ میں بیٹھا ہوا تھا کھڑا ہوا اور میز پر سے موت کی سفید چھڑی اُٹھائی، سر سے اونچی کی اور بہ آوازِ بلند بولا"مارگریٹ اس مقدس عدالت نے تیرے مقدمے کو میزانِ عدل میں تولا، اور تجھے مجرم پایا۔ تیرے ساتھ کسی قِسم کی نرمی برتی نہیں جاسکتی کیونکہ تجھ سے جو معلومات ہم حاصل کرنا چاہتے تھے تو نے اُسے اخفا کیا۔ اپنے بچے کو مار ڈالنے کے جُرم میں تجھے ہم موت کا حکم سُناتے ہیں اور وہ اس طرح کہ تو آگ میں جلائی جائے۔ اس عدالت سے چِتا تک تجھے شہر کے باہر باہر سے جایا جائے گا۔ خدا کا رحم تجھ پر نازل ہو اور اس سے پہلے کہ تیری رُوح تن سے جُدا ہو تیرا ضدّی دل اُس کے رحم وکرم سے پگھل جائے"
بچے کا ذکر آتے ہی، مارگریٹ کے سلب شُدہ ہوش وحواس پھر عود کر آئے۔
فیصلہ سُنانے والے منصف کی خوفناک صورت کو اُس نے دیکھا اور سفید چھڑی کو اُس کے ہاتھوں میں ٹوٹتے سُنا۔ گمشدہ بچے کا خیال، خود اس پر جو وحشیانہ الزام لگایا گیا اور پایۂ ثبوت کو پہونچایا گیا، اپنے محبوب کی یاد جسے آئندہ کبھی

دیکھنا نصیب نہ ہوگا اور پھر وہ خوفناک سزا جو عدالت سے باہر نکلنے کے بعد اُسے ملنے والی تھی، ان سب باتوں کے دھیان سے اُس کی ایک دردناک چیخ نکل گئی۔ یہی انتہائی صدمہ اور تکلیف کی چیخ تھی جو خلا کے رازوں کو چیرتی چلی گئی۔ اور فاؤسٹ جو میفسٹو کے ساتھ اُس غار میں کھڑا تھا اُس کی رُوح میں یہ چیخ تحلیل ہو گئی اور وہ خوف سے کانپنے لگا۔

فاؤسٹ اور میفسٹو ایک پہاڑی پر کھڑے تھے جو روڈا کے قریب تھی۔ اس سے ایک میل کے فاصلے پر ایک اور پہاڑی تھی جس کی طرف یہ دونوں نظر جمائے ہوئے تھے۔ اُس پہاڑی کی چوٹی پر وہ لوہے کی لاٹ صاف دکھائی دے رہی تھی جس کے چاروں طرف لکڑیوں کے گٹھے چُنے ہوئے تھے۔

فاؤسٹ نے کہا "میں وقت پر آ گیا۔ دیکھ۔ لوگوں کی بھیڑ پہاڑی پر ابھی آدھے راستے تک پہونچی ہے۔ میری محبوبہ ابھی دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے اُس پہاڑی پر لے چل۔ پھر میں اُسے بچا لونگا۔"

میفسٹو نے اُس کی طرف تمسخر سے دیکھکر کہا "اِس مقام پر میری قوت ختم ہو جاتی ہے۔ روڈا میری طاقت سے باہر ہے۔ اگر اُسے تُو بچانا ہی چاہتا ہے تو اپنے ہی بل بُوتے اور اپنی ہی ذمہ داری پر بچا۔"

یہ الفاظ گھونسے کی طرح فاؤسٹ کے دل پر لگے۔ ایک لمحہ کیلئے تو اُس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ مُنہ کھولے ہوئے میفسٹو کی طرف دیکھتا رہا۔ جب اِس کا

احساس ہوا کہ میفسٹو نے کس طرح اُسے دھوکا دیا اور فریب میں مبتلا کیا تو غضبناک ہو کر میفسٹو سے بولا۔ "دُنیا کے دل کو چبانے والے زہریلے کیڑے۔ کاش تو مجھے شباب کا لالچ دے کر اس عذاب میں مبتلا نہ کرتا۔ لعنت ہو اس شباب پر، ہزار لعنت۔"

جلدی سے پلٹ کر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ اس پہاڑی سے اُترنے کا کونسا راستہ ہو سکتا ہے جو سامنے والی پہاڑی سے قریب ترین بھی ہو۔ پھر وہ کودا اور بڑی بڑی چھلانگیں مارتا نیچے اُتر میدان میں سرپٹ بھاگا جا رہا تھا جیسے کسی ڈراؤنی بلا سے کوئی ڈر کر بے تحاشا بھاگ رہا ہو۔

میفسٹو اُسے دیکھتا رہا اور پھر ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔ پہاڑی کی چوٹی پر اب کچھ لوگ نظر آنے لگے اور فاؤسٹ بھی پہاڑی کے قریب پہونچ لیا تھا۔ میفسٹو نے ایک مختصر سا جلوس دیکھا جس کے بیچ میں ایک عورت ریشمانوں کا لمبا سفید کُرتا پہنے چل رہی تھی۔ یہ جلوس برف پوش پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ مختصر جلوس بھیڑ میں مدغم ہو گیا، اور اتنے ہی میں پہاڑی پر بڑی تیزی سے فاؤسٹ نے چڑھنا شروع کیا۔

میفسٹو نے ایک فتحمندانہ نظر فاؤسٹ پر ڈالی اور اپنے چغہ میں سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکالا۔ یہ آئینہ وہی تھا جو ایک دفعہ پہلے بھی اس نے فاؤسٹ کے کمرۂ مطالعہ میں نکالا تھا۔ اس آئینہ کو اُس نے دیکھنا شروع کیا۔ بوڑھے فاؤسٹ

کا چہرہ اس میں نظر آرہا تھا جو بڑی منت سماجت سے التجا کر رہا تھا۔ میفسٹو اُس کی طرف دیکھکر اس طرح ہنسا جیسے کوئی منہ چڑائے، پھر اس آئینے کو اس طرح اُوپر اُٹھایا کہ بُوڑھے فاؤسٹ کا مُنہ سامنے والی پہاڑی کی طرف ہے اور اپنے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیکر فاؤسٹ کی طرف اشارہ کر کے کرخت آواز میں بولا:-

"تُونے شباب کو عذاب بتایا........اس عذاب کو میں تجھ سے دُور کر دونگا۔ کم از کم اس عذاب سے تو تجھے نجات دلا ہی دوں.........تُونے خود ہی اسکی خواہش کی ہے۔"

پھر اُس کی آنکھیں دہکنے لگیں اور ان میں شعلے بھڑکتے نظر آئے گویا جہنم کا سانس انہیں ہوا دے رہا تھا۔ چہرہ خباثت سے مسخ ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر اُس نے اپنی بھیانک مسکراہٹ سے آئینہ میں دیکھا اور چیخکر بولا "جیسا تو تھا ویسا ہی ہو جا"۔ اِتنا کہا اور شیطانی جذبہ سے اُس آئینے کو نیچے پتھروں پر دے مارا۔

فاؤسٹ لوگوں کے مجمع سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اپنی مارگریٹ کو لوہے کی لاٹ سے بندھا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ یہ دیکھکر اُس کی رُوح کانپ گئی کہ ایک جلّاد نے مشعلیں روشن کیں اور اپنے ماتحتوں کو دیں۔ صدمے سے دل پاش پاش ہو رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ لیکن اب اُمید بندھ گئی تھی کہ وقت پر پہونچ جائے گا۔ غرض صرف یہ تھی کہ اپنی محبوبہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس سے معافی کا خواستگار ہو۔

پھر ایک دم سے گویا اُس پر بجلی گر پڑی۔ اُس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ اور تھوڑی دیر تک گرا ہوا اپنی بے بسی و بے چارگی پر حیران ہوتا رہا۔ اُٹھا، قدم لڑکھڑائے بمشکل سنبھلا۔ ہاتھوں پر نظر پڑی تو سوکھے اور مرجھائے ہوئے۔ خود بخود چہرے پر ہاتھ پہونچ گئے۔ اب خوفناک حقیقت اُس پر کھل گئی۔

وہ شباب جسے اُس نے عذاب بنایا تھا اور جس کی اِس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی اُس سے چھن گیا تھا۔ اب وہ پھر وہی بوڑھا کمزور فاؤسٹ تھا، سفید لٹیں اور لمبی سفید ڈاڑھی۔ طاقت اُس میں نام کو نہ تھی۔ صرف ارادہ کی قوت تھی جس سے اس عورت تک پہونچنا چاہتا تھا جس کی جسمانی اور رُوحانی ہلاکت کا باعث بنا تھا۔ بڑی مشکل سے لرزتا کانپتا وہ آگے بڑھا اور شدید اذیت و تکلیف سے مجمع میں داخل ہوا۔ لوگوں نے اِس بُڈھے کے لئے راستہ چھوڑ دیا لیکن آگے سپاہیوں نے اُس کا راستہ روک دیا۔ سپاہیوں کے گھیرے میں سے اُس نے مارگریٹ کو دیکھا کہ لوہے کی لاٹ سے کس کر بندھی ہوئی ہے۔ اُس کے خوبصورت بال کھلے ہوئے کمر تک لٹکے ہوئے تھے۔ اعضا میں وہی اگلا سا لڑکپن تھا جیسا اُس وقت تھا جب وادی میں فاؤسٹ نے اُسے اپنی آغوش میں لیکر سینے سے لگایا تھا اور اُسے اپنی ملکہ بنایا تھا۔ مارگریٹ کے چہرے کا خون سُست گیا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اُس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے گویا کسی ایسی ہستی سے کچھ کہہ رہی ہے جسے اور سب نہیں دیکھ سکتے۔

فاؤسٹ نے بڑی تکلیف سے اس منظر کو دیکھا۔ پھر سپاہیوں کے گھیرے میں سے اپنا سر نکال کر باریک کپکپاتی آواز میں کہا۔ "مارگریٹ! مارگریٹ میری پیاری! مارگریٹ!" اُس کی آنکھیں ایک دم سے کھل گئیں گویا وہ نیند سے چونک پڑی تھی، اس آواز نے اس کے احساس کو ٹھوکا دیا۔ اور اُس کی یادداشت کے ساز کو چھیڑ دیا۔ لیکن اُسے صرف ایک بوڑھا کھڑا دکھائی دیا جس کی لمبی سی سفید ڈاڑھی تھی۔ یہ بڈھا سپاہیوں کے گھیرے میں سے اُس کی طرف اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔ مارگریٹ نے اپنے دل میں کہا۔ "بیچارا رحمدل بڈھا!" اُس کی آنکھوں میں ترس کیسا جھلک رہا تھا۔ دُنیا میں کس قدر غمگین ہے۔ اس کے بعد جو سزا اُسے دی جا رہی تھی اس کا سہم اُس پر چھا گیا۔

اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دُعا مانگنے لگی۔ اُس نے دُعا مانگی کہ اُس کے سارے گناہ معاف کر دئے جائیں۔ جنّت میں داخل ہونے کی اجازت ملے یا نہ ملے اس کی اجازت مل جائے کہ اپنی ماں اور بھائی سے مل لے اپنے بچّے کو ایک بار پھر گود میں لے سکے اور ہاں اتنی رعایت اور کی جائے کہ فاؤسٹ کے لبوں پر معافی اور محبّت کا صرف ایک بوسہ ثبت کر سکے۔

پھر شدّتِ خوف کی سنسنی سارے بدن میں دوڑ گئی۔ لکڑیوں میں آگ دیدی گئی تھی اور آگ کے شعلے گھیرا بناتے اُس کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ خوفناک تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ بھیانک سینک پہلے تو لُو کے تھپیڑوں کی طرح اُس کے جسم پر

لگی اور پھر اُسے نوچنے اور کھانے لگی۔ اُس نے ایک چیخ ماری۔

اس کے بعد اُسے کچھ یونہی سا معلوم ہوا کہ کسی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ کوئی شُعلوں کو چیرتا ہوا اُس کے پاس آیا تھا۔ کسی کے رو رو کر التجا کرنے کی آواز اُسے سُنائی دی:۔

"مُعاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو!"

اِس آواز کو سُنکر اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اُسی بُڈھے نے اپنے بازوؤں میں اُسے لے رکھا تھا۔ اُس کی رحم بھری نظریں مارگریٹ کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

بُڈھے نے چیخکر آواز دی "مارگریٹ!"

پھر ایک شُعلہ جھپٹا۔ یہ اندرونی شُعلہ تھا، پہچاننے، سمجھنے اور محبت کا شُعلہ اور اِس شُعلے نے ایک لمحے کے لئے اُن بھُوکے بیرونی شُعلوں کو مسترد کر دیا جنہیں انسان کے ہاتھوں نے بھڑکایا تھا۔ یہ وہ شُعلہ تھا جو زندگی کے مرکزوں کے گرد اُچھل رہا تھا، جیسے رُوح ہوا دے رہی تھی اور اِس میں ایک جلا کر بھسم کر دینے والا جذبہ تڑپ رہا تھا۔ زندگی کا ٹمٹماتا دِیا بُجھنے ہی والا تھا کہ گزشتہ ایک سال کی اُجڑی ہوئی زندگی میں اُس کی جو دلی مُراد تھی وہ اس وقت ایک لمحے میں بر آئی۔ عقیدہ کی تجدید، مسرت و سکون، محبوب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر اُس کھوئی ہوئی محبت کو اُس نے حاصل کر لیا جو بیکراں اور اَبدی ہوتی ہے۔

بڑی کوشش سے اُس نے سِسک سِسک کر کہا:۔

"پیارے! میرے فاؤسٹ...... جانتی تھی کہ تم آؤ گے ضرور..... نشاط..... تمہارے ساتھ مرنا بھی..... نشاط انگیز ہے۔ اللہ بڑا مہربان ہے"!

اتنا کہہ کر اُس کا سر فاؤسٹ کی طرف ڈھلک گیا۔

فاؤسٹ نے اپنے آخری سانس میں بدقّت تمام کہا:۔

"مارگریٹ!...... روشنی کے ستارے...... تُو نے مجھے بچا لیا...... پیاری...... محبّت..... ابدی محبت....."!

اُن دونوں کے لب ملے۔ یہ اُن کی ابدی محبت کی مُہر تھی جسے کوئی اِنسانی آگ جلا نہیں سکتی تھی۔

پھر شعلوں نے انہیں لپیٹ لیا اور آسمان کی جانب ایک نوری چادر بن کر گاتے ہوئے اُٹھے گویا موت اور محبّت کی شادی کی مُبارکباد گا رہے تھے۔

اختتامیہ

پھر ابلیس درِ نور پر آیا۔ اور اُس کا آنا ایسا تھا جیسے آتشین شہابِ ثاقب آسمان پر شرارے چھوڑتا جائے۔ اور اُس کی صدائے پرواز ایسی تھی جیسے اُجڑی ہوئی رُوحوں کے رونے کی آواز۔ اور اُس نے آسمان پر اپنی کہنی ٹکا کر زور سے آواز دی۔

اور درِ نور کھلا اور اُس میں سے بہت تیز روشنی نکلی اور ابلیس نے اپنا مُنہ پھیر لیا کیونکہ وہ اِس روشنی سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔ اور فرشتۂ نور باہر آیا اور اُس کا حُسن ایسا تھا کہ اُسے دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک دہکتی شمشیر تھی۔

پھر ابلیس نے اپنا ہاتھ پھیلایا لیکن اُس کا مُنہ پھرا ہوا تھا۔ اور اُس کے ہاتھ میں معاہدہ تھا اور اُس نے معاہدہ کھول کر پھیلایا اور اُس پر جو الفاظ تھے وہ خُون سے لکھے گئے تھے۔ اور اُس نے فرشتۂ نور کو بآوازِ بلند مخاطب کر کے کہا:۔

سرگذشتِ عروس

ایک اُونچے گھرانے کی لڑکی کی شادی ماں باپ نے روپے پیسے کے لالچ میں ایک مالدار بُوڑھے سے کردی، اُس کے خوفناک نتائج اور بدمزہ زندگی کی جو تفصیل نوجوان دُلھن نے اپنے روزنامچہ میں درج کی تھی، وہ روزنامچہ من وعن کتابی صورت میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ صرف نام اور مقام بدل دئے گئے ہیں تاکہ کسی کا راز فاش نہو، واقعات سب وہی ہیں جو اس مظلوم دُلھن کو پیش آئے۔ لڑکی کسی اور سے محبت کرتی تھی مگر اس کے خلاف مرضی اُس کی شادی ایک ایسے شخص سے کردی گئی جس کے بالوں کی سیاہی شرمندۂ خضاب تھی اور اُس کی بتیسی بھی نقلی تھی۔ اُس بڑھاپے کو بھی برداشت کرلیا جاتا مگر اُس کی آوارگی اور بے پروائی نے نئی دُلہن کا دل توڑ دیا اور اسی شکستہ دلی کے موقع پر وہ شخص آگیا جس سے دُلہن کو دراصل محبت تھی، یہ سین اس روزنامچہ کی جان ہو کیونکہ عشق وہوس میں یہیں امتیاز ہوتا ہے اور اُس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ سمجھدار اور شریف بیویاں اپنے شوہروں سے حد درجہ شاکی، دل برداشتہ اور متنفر ہونے کے باوجود بھی اپنے گوہرِ عصمت کو ضائع نہیں ہونے دیتیں، بوڑھے مہاجن، جوان دُلہن اور اُس کے محبوب عاشق کا کیا حشر ہوا؟ یہ بیان کرنیکی چیز نہیں بلکہ پڑھنے کی چیز ہے۔ اس سے زیادہ دردناک اور عبرت انگیز آپ بیتی آپنے اور کہیں نہ پڑھی ہوگی، یہ ڈائری اس لائق ہے کہ ماں باپ، لڑکے لڑکیاں اور ہر عمر کی عورتیں اسے پڑھیں صفحات (۲۸۰) قیمت عہ

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم وادب دھلی

نرگس جمال

ترجمہ ہے میٹرلنک کے ڈرامہ "جائزل" کا۔ مارس میٹرلنک (بلجیم کا مشہور ڈرامہ نگار)
ہمارے شاہد صاحب کا نہایت محبوب مصنف ہے اور اس میں شک نہیں کہ انکا یہ ذوق نہایت
مشکل پسند ذوق ہے۔

میٹرلنک کے ڈرامہ عموماً چونکہ اسٹیج کیلئے نہیں ہوتے اس لئے ان میں علمی و فلسفیانہ
شان زیادہ پائی جاتی ہے اور طبقہ خواص ہی کی تسکینِ ذوق اُن کا اصل مقصود ہوتا ہے۔

میٹرلنک زیادہ تر "عشق و جمال" اور اُس کے متعلقات سے گفتگو کرتا ہے، اسی لئے اُسکے
یہاں جذبات کی نزاکت و وسعت اور فطرتِ انسانی کی وہ لچک جسے ہم چاہیں تو روحانیت
سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ وہ دہشت انگیز مناظر پیش کرکے دلوں
کو دہلانا پسند نہیں کرتا، وہ انسان کی خوں آشامیوں کے فسانے سُنا کر روح کے
سکون کو مضطرب کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف ان لطیف و پاکیزہ انعطافات کی داستان
سُنانا ہے جو حُسن سے پیدا ہوتے ہیں، محبت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں اور روح
میں جذب ہو کر شاہراہِ انسانیت کو منور بنا جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس ادیب کا ذوقِ سخن یہ ہوگا، اُس کے یہاں خیال کی نزاکت، بیان
کی نُدرت، طرزِ ادا کی جدت اور معنی کے لحاظ سے الفاظ کا اشکال سب ہی کچھ ہوگا، اور ایک غیر
زبان سے ان تمام خصوصیات کو اپنی زبان منتقل کرنا آسان کام نہیں لیکن مسٹر شاہد احمد بی۔اے
اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ (نیاز فتحپوری) قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

مِلنے کا پتہ:۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی

مطبوعات ساقی بک ڈپو۔ دہلی

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
ٹائم -	للعہ	سلامبو-	ے ر	جنت کا بھوت۔	۱۲ر	انکشاف حقیقت	۴ر
کولتار۔	عـ ر	نجم السحر	عمہ	مرزا جبنگی-	۱۲ر	خواب پریشاں	۴ر
کمزوری -	عـ ر	اخوان الشیاطین-	عمہ	قدردان -	۵ر	بیگموں کی چھیڑ چھاڑ	۴ر
روحِ ظرافت-	عمہ	نرگس -	عـ	قرض مقراض	۵ر		
روحِ لطافت-	عمہ	ید قدرت -	۵ر	فرزندِ سرحد-	۵ر	یادِ رفتگاں	۶ر
چمکی -	عمہ	چار چاند-	۸ر	تفویض-	۵ر	طوفانِ ظرافت	۶ر
کھرا پا بہادر-	عہ	عروسِ ادب-	عہ	نادست-	عمہ	من کی آگ -	۶ر
خطوط کی ستم ظریفی	۱۲ر	دلّی کا آخری یادگار	۱۲ر	مسز کرٹھلے-	عہ	دکن کی پری-	۶ر
چینی کی انگوٹھی-	۸ر	لال قلعہ کی جھلک	عہ	دلّی کا اجڑا ہوا قلعہ	۴ر	معاشقہ نپولین	۶ر
سرگذشتِ عروس-	عمہ	سلمیٰ -	۸ر	سات طلاقنوں کی کہانیاں	۴ر	پراسرار دوشیزہ	۸ر
نرگسِ جمال-	عـہ	شریر بیوی-	عمہ			چار انقلابی-	۸ر
پروین وثریا-	عہ	دیکھا جائیگا-	عہ	عشق کی گڑیاں	۴ر	نظم المعراج-	۱۲ر
چندرا موہنی-	عہ	فل بوٹ-	عمہ	گمنام عورت کا خط	۴ر	گہوارۂ تبسم	۴ر
نجمہ نوری-	۱۲ر	ویمپائر-	عـ			تائیس -	عـ
تعلیم زدہ بیوی-	۸ر	ملفوظات ٹامی	۱۲ر	تماشہ پہ تماشہ	۴ر	ہردو یاس -	۱۲ر

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد- دہلی